سُندری کا سودا

جرم وسزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں



احمد یار خان

فہرست

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا ایک اور مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔
اِن چار سچی کہانیوں میں آپ کو وہ سارے رنگ ملیں گے جن کی بدولت احمد یار خان نے جرم و سزا کی صنف میں منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔ اب کسی اچھی کہانی کی تمام خوبیاں بیان کرنے کی بجائے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ یہ احمد یار خان کی کہانی ہے۔ مقبولیت کا یہ عالم کہ بعض پرچوں نے اِسی قسم کی کہانیاں گھڑ کر ان پر کسی وکیل یا پولیس انسپکٹر کا نام دیا ہے۔ ایک دو پبلشروں نے اس قسم کی کہانیوں کی کتابیں چھاپیں اور کتابوں کے ٹائیٹل مکتبہ داستان کے طرز کے بنائے ہیں اور رنگ بھی وہی دیئے ہیں جو ہمارے ٹائیٹلوں کے ہوتے ہیں۔ یہ احمد یار خان کا مقابلہ کرنے کی کوششیں ہیں جو بُری طرح ناکام ہوئی ہیں۔ یہ احمد یار خان کی کہانیوں کی مقبولیت کا ثبوت ہے لیکن اصل اور نقل کا فرق چھُپا نہیں رہ سکتا۔

جرم و سزا کی کہانیوں میں مصنّف نے سب سے بڑی خوبی یہ رکھی ہے کہ یہ حقیقی ہیں اور اِن میں افسانوی رنگ نہیں بھرا گیا۔ واردات جس طرح ہوئی اور مصنّف نے جس طرح تفتیش کی وہ اُس نے من و عن سُنا دی۔ سُنانے کے انداز میں ایسی سادگی اور بے ساختگی جیسے مصنّف دوستوں یاروں کی محفل میں بیٹھا کہانی سُنا رہا ہو۔

احمد یار خان کی کہانیاں اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی ہیں، یعنی اُس دَور کی جسے پُرانا دَور کہا جاتا ہے لیکن یہ کہانیاں پڑھتے وقت آپ محسوس کریں گے کہ یہ گذرے ہوئے دَور کی نہیں یہ تو اِس دَور کے واقعات ہیں جو گزر رہا ہے اور جسے نیا یا جدید دَور کہا جاتا ہے۔ ہم سب کی فطرت نہیں بدلی، ذہنیت نہیں بدلی ہمارے رسم و رواج اور رہنے سہنے کے انداز نہیں بدلے۔ پیری مریدی کا فریب کارانہ اور غیر اسلامی سلسلہ آج بھی ویسے ہی چل رہا ہے جیسے پُرانے زمانے میں چلتا تھا۔ قانون کے ساتھ کھیلنے والے اُس وقت بھی ہمارے معاشرے میں موجود تھے آج بھی موجود ہیں۔ جاگیرداروں اور

بڑے زمینداروں کا بے کسوں اور غریبوں پر حکم اور ظلم آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کبھی ہُوا کرتا تھا۔

کچھ بھی نہیں بدلا۔ سچی اور پاک محبت اور ناجائز تعلقات کے واقعات آج بھی سُننے میں آتے ہیں اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں۔ دیہات کے چوہدری اور مسجدوں کے مولوی آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہُوا کرتے تھے۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ اِن تمام کرداروں کے نام اور حُلئے بدل گئے ہیں اور پولیس کے انداز بدل گئے ہیں۔ ڈرامے اور ناٹک وہی کھیلے جا رہے ہیں جو پُرانے زمانے میں کھیلے جاتے تھے۔

مختصر یہ کہ احمد یار خان کی کہانیاں انسانی فطرت کی وارداتیں ہیں اور یہ ہمارے معاشرے کے نیک و بد کے قصے ہیں۔

عنایت اللہ
مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

محبّت ہو تو ایسی نہ ہو

واردات عام قسم کی چوری کی تھی۔ یہ چھوٹا سا ایک قصبہ تھا جس کی آبادی کی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان تعداد میں کچھ کم تو نہیں تھے لیکن ہندوؤں کی نسبت کم تھے۔ درمیانے درجے کا ایک مسلمان دکاندار تھانے میں یہ رپورٹ لے کر آیا کہ رات اُس کے گھر میں چوری ہو گئی ہے۔

واردات کی تفصیل یہ تھی کہ میاں بیوی صحن میں سوتے ہُوتے تھے۔ اُن کے اندازے کے مطابق آدھی رات کو خاوند کو کمرے میں کھٹکا سنائی دیا۔ چاندنی رات تھی۔ وہ اُٹھنے لگا تو اُسے دھیمی سی آواز سنائی دی — "خاموشی سے لیٹے رہو ورنہ سر کُھل جائے گا" — ایک کلہاڑی اُس کے سامنے آ گئی۔ اُس نے گھبرا کر دیکھا ایک آدمی جس کے چہرے اور سر پر پگڑی لپٹی ہوئی تھی، کھڑا تھا۔ اُس نے ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا۔ اُس کی بیوی چت لیٹی ہوئی تھی اور ایک آدمی اُس کے سرہانے کی طرف کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں لمبا چاقو یا خنجر تھا۔ اس آدمی نے اُس کی بیوی کو خاموش کرا رکھا تھا۔

کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ دکاندار نے اپنے سر پر کھڑے آدمی کی منتیں کیں کہ وہ بہت غریب آدمی ہے اور اس کی حلال کی کمائی کو وہ اُٹھا کے نہ لے جائیں۔ اُسے کہا گیا کہ دھیمی آواز میں بولتے رہو۔ اگر اُونچی آواز نکالی تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

دکاندار کو زیادہ بولنے کا موقعہ نہ ملا۔ کمرے میں سے دو آدمی نکلے۔

ایک نے ایک ٹرنک سر پہ اُٹھا رکھا تھا۔ دوسرے نے اتنا ہی بڑا ایک ٹرنک کندھے پر اور ایک سُوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا رکھا تھا۔ میاں بیوی کو یہ دھمکی سنائی دی ــــ "ہمارے جانے کے بعد بھی تم نے اُونچی آواز نکالی تو مارے جاؤ گے" ــــ اُنہوں نے صحن کا دروازہ کھولا اور نکل گئے۔

دکاندار نے گلا پھاڑ کر واویلا بپا کیا ــــ "چور۔ چور۔ مارے گئے۔ لُوٹے گئے" ــــ اُس کی بیوی نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھا اور بولی "خُدا کے لئے چُپ رہو۔ وہ آجائیں گے اور ہمیں قتل کر دیں گے" ــــ خاوند نے دوڑ کر صحن کے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور ایک بار پھر چلایا ــــ "چور۔ چور"۔

گلی میں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور ان کے ساتھ یہ للکار ــــ "آگئے ....آگئے" ــــ دکاندار نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چار آدمی تھے۔ سب مسلمان تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ــــ "ادھر جاتے دیکھے ہیں" ــــ وہ سب اُدھر کو دوڑ پڑے۔ دکاندار بھی ساتھ گیا۔

یہ محلہ قصبے کے باہر تھا یعنی یہاں قصبہ ختم ہو جاتا تھا۔ اس کی گلی میدان میں ختم ہوتی تھی۔ وہاں درخت بھی تھے۔ وہیں سے گھاٹی اُترتی تھی۔ آگے خشک برساتی نالہ تھا۔ اگلا کنارا گھاٹی کی طرح تھا اور پتھریلا۔ دو چار سو گز آگے پھر درخت اور آگے کھیت۔ یہ علاقہ گھاٹیوں اور ٹیلوں کا تھا۔

دکاندار اور چار آدمیوں نے چوروں کا پیچھا کیا۔ چوروں نے وزن اٹھا رکھا تھا اس لئے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتے تھے۔ تعاقب کرنے والوں نے گھاٹی پر جا کر دیکھا، چاندنی میں چور خشک نالے کے اگلے کنارے پر چڑھ گئے تھے۔ اُن کے پیچھے گئے اور تھوڑی ہی دُور چوروں کو جا لیا۔ ان میں سے دو نے ٹرنک اُٹھا رکھے تھے۔ انہی میں سے ایک نے سُوٹ کیس بھی اُٹھایا ہُوا تھا۔ اُن کے دو ساتھیوں کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ آگے آگے دوڑے جا رہے تھے۔

تعاقب کرنے والے جوان اور دلیر تھے۔ وہ چوروں کے قریب

پہنچے تو چوروں کو للکارا۔ انہوں نے ٹرنک پیچھے کو پھینکے۔ ان میں سے کسی ایک کی آواز سنائی دی ــــ "سُوٹ کیس نہ پھینکنا" ــــ ان کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ نکل گئے۔ سُوٹ کیس ساتھ لے گئے۔ تعاقب کرنے والے رُک گئے۔ ان کے پیچھے چوکیدار بھی آرہا تھا۔ ان لوگوں نے ٹرنک وہیں پڑے رہنے دیئے۔ محلّے کے کئی اور آدمی آگئے تھے۔ ان میں سے تین چار نوجوان کلہاڑیوں لاٹھیوں وغیرہ سے مسلّح ہو کر ٹرنکوں کے پہرے پر بیٹھ گئے۔

صبح ابھی دُھندلی تھی جب دکاندار چوکیدار اور دو تین آدمیوں کے ساتھ تھانے میں آیا۔

سُوٹ کیس میں زیورات اور نقدی

میں نے دکاندار سے بہت سی باتیں پوچھیں جو چوری کی واردات کے متاثرہ افراد سے پوچھی جاتی ہیں۔ اصل مال سُوٹ کیس میں تھا۔ اس میں اُس کی بیوی کے زیورات اور چار ہزار روپیہ نقد تھا۔ اُس زمانے کا چار ہزار روپیہ آج کے ساٹھ ہزار روپے کے برابر تھا۔ آج کل تو اَن پڑھ لوگ بھی پیسہ بنکوں میں جمع کرا دیتے ہیں، اُس دور میں لوگ روپیہ پیسہ گھروں میں رکھتے تھے۔

دکاندار کے گھر میں صرف دو افراد تھے ــــ وہ اور اُس کی بیوی ــــ گھر کا تیسرا فرد اُس کا بیٹا تھا جو رات گھر سے غیر حاضر تھا۔ اس لڑکے کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ یہ ان کی واحد اولاد تھی۔ لڑکے کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گھر میں ہوتا تو ایک چور اُس کے بھی سرہانے کھڑا ہو کر اُسے چُپ کرائے رکھتا۔

میں نے پہلی بات یہ نوٹ کی کہ ایک چور نے کہا تھا کہ سُوٹ کیس نہ پھینکنا۔ اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ چوروں کو معلوم تھا کہ سُوٹ کیس میں زیورات اور نقدی ہے۔ دکاندار نے بتایا کہ سُوٹ کیس مقفّل تھا۔ مجھے خیال آیا کہ چوروں

نے اسے کھول کر نہیں دیکھا، ورنہ وہ سُوٹ کیس اُٹھانے کی بجائے زیورات اور رقم نکال کر پوٹلی میں باندھتے اور لے جاتے۔ ٹرنکوں میں قیمتی کپڑے تھے۔ ان میں سے کچھ لڑکے کی شادی کے لئے تھے اور کچھ لڑکے کی ماں کے تھے۔ ان کے علاوہ ان میں کپڑے، تکیوں کے غلاف، چادریں اور کھیس وغیرہ تھے۔

قدرت کو میرا کڑا امتحان منظور تھا۔ میں موقعۂ واردات پہ جانے کے لئے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ آندھی آگئی اور اس کے ساتھ مینہ برسنے لگا۔ اس کا نقصان یہ نہیں تھا کہ میری تفتیش رُک گئی تھی بلکہ یہ کہ چوروں کے کھُرے تباہ ہو گئے تھے۔ آپ کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ سراغرسانی کے لئے کھُرا کتنی کارآمد چیز ہوتی ہے۔

میں واردات والے گھر گیا۔ میرے پوچھنے پہ دکاندار نے یقین سے بتایا کہ اُس نے سونے سے پہلے صحن کے دروازے کی زنجیر چڑھائی تھی۔ یہ معمولی سا مکان تھا جس کی صحن کی دیوار تقریباً ساڑھے سات فٹ اُونچی تھی۔ میں نے دیوار کو باہر سے دیکھا۔ بارش نے تمام نشان (اگر کوئی تھے) دھو ڈالے تھے۔ دیوار تھی تو اونچی لیکن چور اس سے بھی اونچی دیواریں پھاند جایا کرتے ہیں۔ میں نے اندر سے بھی دیوار دیکھی۔ یہ اینٹوں کی دیوار تھی۔ اندر کی طرف سفیدی کی ہوئی تھی۔ ایک جگہ مجھے ایسا نشان نظر آیا جیسے اوپر سے اُترنے والے آدمی نے یہاں پاؤں کے پنجے رکھے اور پنجوں کی رگڑ دیوار پہ لگی۔ اس نشان کو بارش نے مٹانے کی بجائے واضح کر دیا تھا۔

پولیس کا ایک کانسٹیبل بھی جانتا ہے کہ مجرم ایک سے زیادہ ہوں تو ایسی دیوار کس طرح پھاندی جاتی ہے۔ باہر ایک آدمی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہوا۔ دوسرا آدمی اس کے کندھوں پر چڑھ گیا اور دیوار پہ جا کر اندر کو اس طرح اُترا کہ اُوپر دیوار پکڑی اور دیوار پہ پاؤں کے پنجے جما کر اُتر گیا۔ اس نے صحن کے دروازے کے اندر سے زنجیر کھول دی اور باقی ساتھی اندر چلے گئے۔

ٹھنگنے خاوند کی لمبی بیوی

کمرے میں جا کر دیکھا۔ ایک بڑا کمرہ اور اس کے ساتھ دو چھوٹے کمرے تھے۔ یہ کوٹھڑیاں سی تھیں۔ ان میں سے ایک میں ٹرنک، دو چارپائیاں اور کچھ اور سامان پڑا تھا۔ جو ٹرنک اُٹھاتے گئے وہ ایک ایک ٹرنک کے نیچے رکھے تھے۔ سوٹ کیس رضائیوں اور گدّوں والی پیٹی کے اندر ایک رضائی کے نیچے رکھا تھا۔ پیٹی کو تالہ نہیں لگا ہُوا تھا ـــــ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ چور گھر کے بھیدی تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے مطلب کا مال کہاں پڑا ہے۔ ٹرنک ٹرنکوں کے نیچے سے وہ اُٹھاتے گئے جن میں قیمتی پارچات تھے اور سوٹ کیس وہ اٹھایا گیا جس میں زیورات تھے، حالانکہ یہ پیٹی کے اندر ایک رضائی کی تہہ میں رکھا تھا۔

چوروں میں سے کوئی ایک گھر بھیدی تھا۔ انہوں نے واردات اُس رات کی جس رات دکاندار کا جوان بیٹا گھر میں نہیں تھا۔ وہ ہوتا تو شاید کچھ مقابلہ کرتا۔

میں نے دکاندار اور اُس کی بیوی کو بٹھا لیا۔ دکاندار گول مٹول اور ٹھنگنا سا آدمی تھا اور اُس کی بیوی لمبے قد، بڑے اچھے رنگ اور دل کش نقش و نگار کی عورت تھی۔ میں نے تفتیش سے ہٹ کر سوچا کہ ان کے والدین نے کیا جوڑ ملایا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ عورت جس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی، باتونی اور بلاوجہ بولنے والی تو نہیں لگتی تھی لیکن میں جو سوال اُس کے خاوند سے پوچھتا تھا، اس کا جواب وہی دیتی تھی اور خاوند اس کی تائید میں سر ہلا دیتا یا کہہ دیتا ـــــ "ہاں حضور! ایسے ہی ہے"۔ اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ آدمی خاصا بدھو ہے اور بیوی اس پہ چھائی ہوتی ہے۔ بہرحال یہ میاں بیوی کا معاملہ تھا، واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"گھر میں نوکر ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"نوکرانی؟" — میں نے پوچھا — "یا کوئی عورت کپڑے یا برتن دھونے آتی ہو؟"

"گھر کا سارا کام میں خود ہی کرتی ہوں"۔ گھر والی نے جواب دیا۔

اُنہوں نے بتایا کہ دکان میں بھی کوئی نوکر نہیں۔ میں نے اس کی بیوی سے پوچھا کہ محلّے کی کوئی ایسی عورت گھر میں آتی جاتی ہو گی جسے معلوم ہو کہ سُوٹ کیس پیٹی میں رکھا ہے اور فلاں فلاں ٹرنک میں قیمتی کپڑے ہیں۔ محلّوں میں ایسی عورتیں ہوتی ہیں جو گھروں میں اوپر کا کام کرتی ہیں یا اُس کلاس کی عورتیں بغیر کام کے لوگوں کے گھروں میں جاتی رہتی ہیں۔ زبان کی اتنی میٹھی کہ اونچے اور امیر گھرانوں کی عورتوں کی ہمراز بن جاتی ہیں۔ ایسی عورتیں رشتے ناطے بھی کراتی ہیں۔ ان میں بعض عورتیں پیشہ ور چوروں اور نقب زنوں کی ایجنٹ ہوتی ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں گھر میں بڑی دولت ہے اور وہ کہاں پڑی ہے۔

دکاندار کی بیوی نے کچھ دیر سوچ کر بتایا کہ اُس کے ذہن میں ایسی کوئی عورت نہیں آئی۔ اُس کے خیال میں محلّے میں مشکوک چال چلن کی کوئی عورت نہیں تھی۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ سوچ کر بتائے کہ محلّے کی کس عورت کو معلوم ہے کہ زیورات والا سُوٹ کیس رضائیوں کی پیٹی میں پڑا ہے — اُس نے کسی بھی عورت کا نام نہیں لیا۔

اُس کے خاوند سے پوچھا کہ اُسے کسی پر شک ہو گا اور یہ کہ یہ واردات انتقامی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔ اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی یا کاروباری رقابت ہو گی۔ اُسے معلوم ہو گا کہ زیورات اور رقم سُوٹ کیس میں اور سُوٹ کیس پیٹی میں ہے۔ اُس نے بھی کسی کا نام نہ لیا۔ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی۔

"دونوں یہ کان کھول کر سُن لو" — میں نے انہیں کہا — "تمہارے اپنے دماغ اگر کام کرتے ہیں تو تم سمجھ گئے ہو گے یہ چوری کسی گھر بھیدی نے کرائی ہے۔ چور جادوگر نہیں ہوتے کہ انہیں پتہ چل جائے کہ مال کہاں

رکھا ہے۔ گھر بھیدی گھر میں ہوتا ہے یا گھر میں آتا جاتا رہتا اور ہر بھید جانتا ہے۔ اگر میری مدد کرو گے تو مال مل جائے گا۔ اگر نہیں تو بڑی مشکل ہے۔ سوچتے رہو۔ تمہارے دماغوں میں کوئی مرد یا کوئی عورت ضرور آ جائے گی۔"

سونے کی انگوٹھی

میں نے دکاندار کو ساتھ لیا اور اُس جگہ جانے کو کمرے سے نکلا جہاں چور ٹرنک پھینک گئے تھے۔ میں ایک بار پھر دیوار کو اندر سے دیکھنے رُک گیا جہاں کسی کے اُترنے کے نشان تھے۔ اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ فرش پر کیچڑ میں چمکتی ہُوئی کوئی چھوٹی سی چیز نظر آئی۔ میں نے اٹھائی تو یہ انگوٹھی تھی۔ دکاندار کو اور اُس کی بیوی کو دکھائی۔ دونوں نے کہا کہ یہ ان کی نہیں۔ بیوی سے میں نے کہا کہ وہ اور غور سے دیکھے۔ وہ بڑی دھیمی آواز میں بولی — "نہیں یہ ہماری نہیں۔"

میں نے اُس سے انگوٹھی لے کر جیب میں ڈال لی اور کہا — "چور اپنی نشانی چھوڑ گئے ہیں۔"

یہ عام قسم کی سادہ سی انگوٹھی تھی جو ہر ایک سنّار کے ہاں تیار ملتی تھی۔ اس کی بناوٹ خاص ہوتی تو میں سنّاروں کی مدد لے سکتا تھا.... میں ٹرنکوں والی جگہ گیا۔ ٹرنک ایک دوسرے سے دُور دُور پڑے تھے۔ ایک اُلٹا ایک سیدھا۔ آندھی اور بارش نے کوئی کھُرا کھوج نہیں رہنے دیا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ کاغذی کارروائی کرے اور ٹرنک تھانے پہنچا دے۔ تماشائیوں میں وہ چار آدمی بھی موجود تھے جنہوں نے رات چوروں کا تعاقب کیا تھا۔ میں نے ان سب کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ انہوں نے کہاں تک تعاقب کیا اور چور کس طرف چلے گئے تھے۔ اُنہوں نے میرے سوال کا جواب تفصیل سے دیا اور مجھے وہاں تک لے گئے جہاں

انہوں نے تعاقب ترک کیا تھا۔ وہ یہ نہ بتا سکے کہ چور آگے جا کر کس طرف چلے گئے تھے۔ آگے زمین اونچی نیچی تھی اور چاندنی میں اتنی دُور تک دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ وہ اُس وقت اتفاق سے چھت پہ بیت الخلا میں گیا تھا۔ اُسے "چور چور" کا شور سنائی دیا تو اُس نے نیچے دیکھا۔ دو آدمی ٹرنک اٹھائے دوڑے جا رہے تھے اور دو آدمی بغیر کسی سامان کے آگے آگے دوڑے جا رہے تھے۔ اُس کے مکان کی چھت سے خشک نالہ نظر آتا تھا۔ وہ دوڑ کر نیچے آیا۔ اتنے میں تین اور جوان آگئے۔ یہ چار ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے پاس ڈنڈہ اور ایک کے پاس ہاکی سٹک تھی۔ باقی دو خالی ہاتھ تھے۔

میں نے نمبردار اور چوکیدار سے کہا کہ وہ چند قابلِ اعتماد آدمیوں کو ساتھ لیں اور دُور آگے تک کے علاقے کی تلاشی لیں۔ ہو سکتا ہے چور سُوٹ کیس سے زیورات اور نقدی وغیرہ نکال کر لے گئے ہوں اور خالی سُوٹ کیس پھینک گئے ہوں۔

نمبردار اور چوکیدار فوراً آگے چلے گئے۔ میں سمت معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جدھر چور گئے تھے۔ چور اُسی قصبے کے ہو سکتے تھے۔

چور اناڑی تھے

میں دکاندار کو اور تعاقب کرنے والے آدمیوں کو تھانے لے گیا۔

میں تھانے میں جو ہدایات دے آیا تھا، ان پر عملدرآمد شروع ہو گیا تھا۔ قصبے کے چار پانچ مشتبہ، سزا یافتہ اور عادی مجُرم بلاتے جا چکے تھے۔ اردگرد کے دیہات کے اس قماش کے آدمیوں کو تھانے لانے کے لئے کانسٹیبل چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں الگ بٹھا لیا۔

میں جس وقت کی کہانی سُنا رہا ہوں، اُس وقت ہر جرائم پیشہ آدمی کا اپنا جو فن تھا وہ اسی کا کمال دکھایا کرتا تھا۔ مثلاً سنسان راہوں پہ راتوں کو مسافروں کو روک کر [illegible] والے شہروں میں آکر چوری نہیں کرتے تھے۔

شہروں میں چوریاں کرنے والے رہزنی نہیں کرتے تھے۔ ان میں جو تالے توڑنے کے ماہر تھے وہ تالے ہی توڑا کرتے تھے، نقب نہیں لگاتے تھے۔ نقب ایک الگ فن تھا۔ ہر چور نقب نہیں لگاتا تھا کیونکہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ تھانوں میں ان لوگوں کا ریکارڈ اتنا مکمل ہوتا تھا کہ ہمیں کسی واردات کی سراغرسانی میں مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ ہم طریقۂ واردات سے سمجھ جاتے تھے کہ یہ فلاں کا کام ہے۔

چوری کی یہ واردات مجھے پیشہ وروں کی نظر نہیں آتی تھی۔ چور چار بتاتے گئے تھے، یعنی یہ ایک گروہ تھا۔ اگر گروہ تھا تو ڈاکوؤں کا ہو سکتا تھا لیکن جس طرح وہ بھاگے اور ٹرنک پھینک گئے، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اناڑی تھے۔ اگر وہ منظم اور پیشہ ور ڈاکو ہوتے تو رُک کر اپنے پیچھے آنے والوں کا مقابلہ کرتے اور ان میں سے ایک دو کو قتل یا زخمی کر جاتے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ٹرنک اُٹھانے کی زحمت ہی نہ کرتے۔ گھر میں صرف ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ انہوں نے دونوں کو خاموش اور بے بس کر رکھا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا مطلوبہ مال کہاں ہے۔ وہ مال ٹرنکوں اور سُوٹ کیس میں سے نکال کر گٹھڑی میں باندھ لیتے۔

میں نے طریقۂ واردات کو ہر زاویے سے دیکھا۔ یہ چاروں مجھے اناڑی اور نوآموز نظر آتے تھے۔ یہ ان کی پہلی واردات معلوم ہوتی تھی اور یہ کوئی نیا گروہ تھا جو میرے ریکارڈ پر نہیں تھا۔

تھانے میں جو سزا یافتہ اور بدمعاش وغیرہ آ چکے تھے، انہیں میں نے اکٹھے بٹھا کر اتنا ہی کہا کہ ان میں سے جو بھی اس واردات میں شامل تھا، وہ خود ہی بتا دے۔ سب نے انکار کیا۔ میں نے انہیں کہا کہ انہیں معلوم ہے کہ میں اتنی جلدی مطمئن نہیں ہُوا کرتا۔ وہ سوچ لیں اور جو کوئی اس واردات کے متعلق کچھ بتانا چاہے آ کر میرے کان میں بتا دے۔ میں کیس گول کر دوں گا۔ اگر میرے اندازے کے مطابق سوچنے کا وقت گزر گیا تو پھر میں ذرا سی بھی رعایت نہیں دوں گا — انہیں یہ کہہ کر الگ بٹھا دیا کہ

جب تک کچھ بتائیں گے نہیں، تھانے سے باہر نہیں جاسکیں گے ۔

تعاقب کرنے والوں کو اس ہدایت کے ساتھ چھٹی دے دی کہ وہ کسی سے ذکر نہ کریں کہ انہوں نے کیا بیان دیا ہے اور میں ان سے کیا کچھ پوچھتا رہا ہوں اور یہ کہ وہ ہر وقت گھر میں موجود رہیں۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

چوکیدار مسلمان تھا

تین چار دن اور راتیں جرائم پیشہ آدمیوں کے ساتھ جھک جھک ہوتی رہی۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہمارا رویہ اور پوچھ گچھ کا طریقہ مختلف ہوا کرتا تھا۔ بعض کے ساتھ زبانی باتیں ہوتیں اور بعض لاتوں کے بھوت ہوتے تھے، اور ان میں ایک دو ایسے بھی ہوتے تھے جن کے ساتھ ہم کام کی معلومات کے عوض سودا بازی بھی کر لیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی ذہانت اوسط درجے کے پولیس انسپکٹر جتنی ہوتی تھی۔ ان میں سے بعض سراغرسانی کے بھی ماہر ہوتے تھے۔ وکالت کے گر بھی جانتے تھے۔

میں نے ان میں سے سخت جان افراد کو اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا اور جو ذہین اور اُستاد تھے انہیں اپنے پاس رکھا۔ اگر میں آپ کو یہ سنانے لگوں کہ ہر ایک سے ہم نے کیا پوچھا، انہوں نے کیا کیا جواب دیتے اور میں نے ان جوابوں سے کتنے قابل قبول سمجھے اور کیوں، تو یہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ مختصر یہ کہ ان میں سے بعض استادوں نے میری اس رائے کی تصدیق کر دی کہ چوروں میں سے کوئی گھر بھیدی ہے اور گھر بھیدی ان کے ساتھ نہیں تھا وہ محلے کا کوئی فرد ہو سکتا ہے۔ میری رائے تو یہ بھی تھی کہ واردات کسی اُستاد کی نہیں۔ ان جرائم پیشہ استادوں میں سے دو میرے معتمد تھے۔ تین چار بڑے پیچیدہ

کیسوں میں اُنہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر میری مدد کی تھی۔ انہوں نے میرا ذہن صاف کر دیا۔ یہ تو مجھے پہلے ہی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کوئی منظم گروہ معلوم نہیں ہوتا .... تین چار دنوں کی کاوش اور مغز کھپائی سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی کچے چور تھے اور یہ واردات کسی گھر بھیدی کی راہنمائی میں ہوئی ہے۔

میرے مخبر بھی مصروف تھے۔ ابھی کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے چوکیدار کو بلایا اور اُس سے بہت کچھ پوچھ کر یہ بھی پوچھا کہ جب دکاندار کے گھر سے شور اُٹھا اُس وقت وہ کہاں تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ کچھ دیر پہلے واردات والی گلی کا چکر لگا کر دوسری گلی میں چلا گیا تھا۔ اُس نے شور سُنا تو اس گلی میں آیا۔ اُس وقت چور گلی سے نکل گئے تھے اور تین چار آدمی ان کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ اُس نے اس سے پہلے اپنی ڈیوٹی کے علاقے میں کوئی اجنبی یا جان پہچان کے آدمی گزرتے نہیں دیکھے تھے۔

اُس دور میں قصبوں میں سرکاری چوکیدار ہوا کرتے تھے۔ یہ ٹاؤن کمیٹیوں کا انتظام ہوتا تھا۔ ہر وارڈ میں رات کو ایک چوکیدار پہرہ دیا کرتا تھا۔ ان کا میٹ (انچارج) بھی ہوا کرتا تھا۔ اکثر قصبوں میں نیپالی گورکھے چوکیدار ہوتے تھے۔ یہ لوگ دیانتدار اور ڈیوٹی کے سخت پابند تھے۔ سکھ اور مسلمان بھی یہ نوکری کرتے تھے لیکن یہ گورکھوں کی طرح دیانتدار نہیں تھے۔ کوئی نامی گرامی ڈاکو انہیں زیادہ لالچ دے تو واردات کرا دیا کرتے تھے۔ پٹھان بھی گورکھوں کی طرح دیانتدار نہیں تھے۔

یہ چوکیدار مسلمان تھا۔ مجھے اس پر بھی شک تھا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ اس کا دوستانہ دکاندار کے ساتھ ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ یہ دکاندار کے گھر آتا جاتا ہو۔ پھر یہ بھی شک ہوا کہ اس کی بیوی دکاندار کے گھر کی بھیدی ہوگی۔ پتہ چلا کہ اُس کی بیوی بچے کی پیدائش کے لئے اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے اور اُس کا واردات والے گھر آنا جانا بالکل

نہیں تھا۔اس کی تصدیق مجھے اپنے خفیہ ذرائع سے بھی کرانی تھی۔

یہ خاص طور پہ پیشِ نظر رکھیں کہ قتل کی تفتیش چوری کی نسبت آسان ہوتی ہے۔قتل کا باعث معلوم ہو جائے تو قاتل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔چوری کا باعث چوری ہی ہوتا ہے۔مال غائب کر دیا جاتا ہے۔جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں مال لاپتہ ہو جاتا ہے۔زیورات صرافہ بازار میں جاتے ہی پگھل کر سونے کی ایک ڈلی بن جاتے ہیں۔سراغ اور کھُرے کھوج غائب ہو جاتے ہیں اور چور سینہ تانے آپ کے سامنے گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔تھانیداروں کو مُخبروں اور اپنی عقل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

نمبردار بھی ہماری مدد کیا کرتے تھے۔نامی گرامی جرائم پیشہ آدمیوں کے ساتھ ان کا دوستانہ ہوتا تھا۔اگر نمبردار دلیر اور عقلمند ہو تو اُس کا مُخبری کا اپنا ذاتی انتظام بھی ہوتا تھا۔نمبرداروں کی حیثیت سرکاری تھی لیکن وہ کچھ غیر سرکاری حرکتیں کر کے بھی سرکار کو خوش رکھتے تھے۔ایسے نمبردار بعض اوقات چوری کا مال برآمد کرا دیا کرتے تھے لیکن اس شرط پر کہ مُجرم کو گرفتار نہ کیا جائے۔بعض وارداتوں کے مجرموں کو وہ گرفتار کرا بھی دیا کرتے تھے۔

جوان بیٹا ماں کی طرح خوبصورت

میں نے متعلقہ نمبردار کو بلایا اور اُس سے پوچھا کہ اُس نے کھوج لگانے کی کوشش کی ہے یا نہیں۔اُس نے بتایا کہ وہ بہت کوشش کر چکا ہے لیکن کوئی کھوج نہیں ملتا۔میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ کہاں تک ممکن ہے کہ چوری اس دکاندار کے اپنے کسی رشتہ دار نے کرائی ہو؟

"اس بیچارے کی دشمنی کسی کے بھی ساتھ نہیں"— نمبردار نے جواب دیا —"یہ تو سیدھا سادا اور بالکل بُدھو انسان ہے....اگر اس کے کسی رشتہ دار پہ شک کرنا ہے تو میں اس کے بیٹے پہ شک کروں گا"

"بیٹے پہ؟"— میں نے حیران ہو کر کہا —"اس کا تو سُنا ہے ایک ہی بیٹا ہے اور وہ باپ کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے"

"میں یقین سے تو کہہ نہیں سکتا"— نمبردار نے کہا —"البتہ لڑکا ٹھیک نہیں۔باپ جتنا بُدھو اور بھلے مانس ہے بیٹا اتنا ہی آوارہ، شیطان اور دلیر ہے۔جُوا بھی کھیل لیتا ہے اور بدمعاشی بھی کر لیتا ہے۔اس کی عادتیں اپنی ماں جیسی ہیں اور اُسی کی طرح دلیر ہے اور ماں کی ہی طرح خوبصورت ہے"

"کیا دکاندار کی بیوی بھی آوارہ، شیطان اور دلیر ہے؟"

"میں اسے آوارہ تو نہیں کہہ سکتا"— نمبردار نے جواب دیا —"جب بیاہی ہُوئی یہاں آئی تھی تو دل پھینکنے والے اس پہ ڈورے ڈالنے لگے تھے۔اُن کا خیال تھا کہ یہ لڑکی ایسے بدصورت اور ٹھنگنے آدمی کے ساتھ خوش اور مطمئن نہیں ہو گی۔آپ نے اسے دیکھا ہے۔اس کے خاوند کو بھی دیکھا ہے۔کیا آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عورت اس آدمی کو دل سے چاہتی ہو گی؟"

"اس کے بیٹے پر تم کیوں شک کر رہے ہو؟"

"شاہ خرچ ہے"— نمبردار نے جواب دیا —"آوارہ ہے۔ماں باپ کے لاڈ اور پیار سے بگاڑ رکھا ہے۔دکان پر زیادہ نہیں بیٹھتا۔شہر جاتا ہے۔سینما دیکھتا ہے۔رنڈیوں کا گانا سُننے جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا اخلاق اور کردار ہے ہی نہیں۔اگر آپ خود اس سے پوچھ گچھ کریں یا اس کے دوستوں سے پوچھیں تو آپ کو شاید کچھ حاصل ہو جائے۔یہ لڑکا اُن بدمعاشوں میں سے ہے جو اپنی بہنوں اور ماؤں کا زیور چُرا کر بازی پہ لگا دیا کرتے ہیں"

"آج اتنے دن گُزر گئے ہیں میں نے اس لڑکے کو نہیں دیکھا"— میں نے کہا —"اس کے باپ نے مجھے گھر کے افراد کی تفصیل بتاتے ہُوئے کہا تھا کہ اس کا ایک بیٹا ہے جو واردات کی رات گھر نہیں تھا۔میں نے

اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی کیونکہ اس کا چوری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

"میرا دماغ ناقص ہے سرکار!"— نمبردار نے کہا— "آپ اپنی تفتیش کر لیں، پھر میں کچھ بتاؤں گا۔ میں آپ کے دماغ کو شکوک سے نہیں بھرنا چاہتا۔ اس لڑکے کو واردات کے بعد میں نے بھی نہیں دیکھا۔"

مجھے نمبردار کا مشورہ پسند آیا۔ میں نے دکاندار کو بلایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ واردات کے متعلق زیادہ باتیں ہوئیں اور میں نے اُس سے اُس کے بیٹے کے متعلق اس طرح پوچھا جیسے میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے کہا— "تمہارا بیٹا کبھی نظر نہیں آیا۔ اسے کبھی کبھی تھانے میں تفتیش کے متعلق پوچھنے کے لئے آنا چاہیئے۔"

"وہ تو اُس روز سے گھر سے غائب ہے"— اُس نے کہا۔

"تمہیں یا ماں کو بتا کر نہیں گیا کہ کہاں جا رہا ہے؟"— میں نے پوچھا۔

"بتا کر گیا تھا"— اُس نے جواب دیا— "کہتا تھا شہر فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ ہفتے میں ایک دو دفعہ شہر اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے ضرور جاتا ہے۔"

"تم نے اس کے دوستوں سے پوچھا نہیں کہ وہ واپس کیوں نہیں آیا؟"

"پوچھا تھا"— اُس نے جواب— "وہ سچی بات نہیں بتاتے۔ کہتے ہیں کہ شبیر (بیٹا) ان کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ کبھی کہتے ہیں کہ اکیلا گیا تھا۔"

"تم نے ان پر کوئی شک نہیں کیا؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا— "وہ دِلّی سیر سپاٹے کے لئے چلا گیا ہوگا۔ اُس کے دوست مجھ سے چھپاتے ہیں۔"

"پہلے کبھی دِلّی گیا تھا؟"

"دو بار گیا تھا"— اُس نے جواب دیا— "لیکن دونوں مرتبہ بتا

کر گیا تھا۔ اب اُس نے نہ مجھے بتایا نہ اپنی ماں کو۔"

"اُس کی ماں تو بہت پریشان ہوگی"— میں نے کہا۔

"نہ جی!"— اُس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا— "اُس کی ماں بالکل پریشان نہیں۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں تھانے میں رپورٹ درج کرا دیتا ہوں کہ میرا بیٹا لاپتہ ہے اور اس کے دوست مجھے سچی بات نہیں بتاتے۔ اس کی ماں نے مجھے تھانے جانے سے منع کیا اور بولی کہ بچہ تو نہیں، گھوم پھر کر آجائے گا۔"

میں یہ سُن کر حیران بھی ہُوا اور پریشان بھی کہ اکلوتے بیٹے کی اتنی لمبی غیر حاضری پر ماں پریشان نہیں تھی اور اُس نے اپنے خاوند سے یہ بھی کہا کہ وہ تھانے رپورٹ نہ کرے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں جب تفتیش کے لئے اُن کے گھر گیا تھا تو ماں نے بیٹے کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ وہ پریشان ہوتی تو مجھے ضرور بتاتی کہ گزشتہ رات اُس کا بیٹا گھر نہیں آیا۔ اب تو آٹھ دس دن گزر گئے تھے۔

واردات چوری کی تھی۔ ایک عام ذہن کا آدمی تسلیم نہیں کر سکتا کہ گھر والی اور اُس کے بیٹے نے اپنے ہی گھر چوری کرائی ہوگی۔ یہ تو کبھی سُننے میں آتا تھا کہ میاں بیوی آپس میں خوش نہیں۔ بیوی نے کچھ رقم یا اپنے زیورات اپنے ماں باپ کے گھر پہنچا دیئے اور واویلا بپا کر دیا کہ کوئی چُرا کر لے گیا ہے۔ بعض خاوند اپنی بیویوں کے زیورات کی کوئی چیز اِدھر اُدھر کر کے بیویوں پر الزام عائد کر دیا کرتے تھے کہ اپنے ماں باپ کو دے آئی ہے۔ یہ سب طلاق لینے دینے کے بہانے ہوتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے، مگر اپنے گھر میں اس طرح چوری کرانا جس طرح اس گھر میں ہوئی، عام انسان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

میرا ذہن عام شہری کا نہیں پولیس آفیسر کا دماغ تھا۔ انسانی فطرت کو نفسیات کے عالم سمجھ سکتے ہیں یا پولیس آفیسر بشرطیکہ وہ اپنی سرکاری ٹریننگ اور تفتیش کا سبق پڑھانے والی کتابوں سے ہٹ کر اپنی فہم و فراست

استعمال کرے۔ میرے سامنے جو صورتِ حال آگئی تھی، اسے سمجھنے کے لئے مجھے اپنے مشاہدات، تجربات اور عقل کی ضرورت تھی۔ میں تو تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ یہاں مجھے مداریوں جیسے کرتب دکھانے تھے۔

"تمہاری بیوی اپنے بیٹے کی غیر حاضری پر پریشان نہیں"— میں نے دکاندار سے کہا — "تم اس سے کیا سمجھے ہو کہ وہ کیوں پریشان نہیں؟"

"وہ اپنی ماں کو بتا کر گیا ہوگا"— اُس نے کہا۔

"لڑکے پر زیادہ اثر تمہارا ہے یا تمہاری بیوی کا؟"

"ماں کی زیادہ سنتا ہے"— اُس نے جواب دیا — "میری کم ہی سُنتا ہے۔"

"شاید اس کی ماں بھی تمہاری کم ہی سُنتی ہے"— میں نے کہا — "اور میرا خیال ہے کہ ماں بیٹا تمہارے قابو میں نہیں۔"

میں نے اسے ذرا چکر دینے کے لئے کہا — "سُنا ہے تمہارا بیٹا بڑا اچھا لڑکا ہے۔"

"اچھا نہیں تو بُرا بھی نہیں"— اُس نے جواب دیا۔

"تمہیں اس کے خلاف کوئی شکایت تو نہیں؟"

اُس نے جواب دینے کی بجائے سر ہلایا کہ نہیں — اُس کی اس انداز کی نہیں میں مایوسی بلکہ شکست سی تھی۔ میں اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تفتیش کا میرا انداز اپنا ہی تھا۔ میں نے اُسے یہ تاثر دیا کہ اُس کے گھریلو معاملات کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُس سے یہ پوچھا کہ اس کا بیٹا کون کون سے دوست کے ساتھ سینما دیکھنے جاتا ہے۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ اس قصبے میں کوئی سینما ہال نہیں تھا۔ پچیس میل دور ضلعے کا شہر تھا۔ وہاں تین سینما ہال تھے۔ قصبوں اور دیہات کے لوگ وہاں فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔

لڑکے کے باپ نے دو لڑکوں کے نام پتے بتا دیئے۔ میں نے دکاندار کو فارغ کر دیا اور ان دونوں لڑکوں کو تھانے بلانے کا انتظام کیا۔

خوبصورت ماں، عیاش بیٹا

دونوں سترہ اٹھارہ سال کی عمر کے مسلمان لڑکے تھے۔ ان میں ایک میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ وہ چوروں کا تعاقب کرنے والوں میں سے تھا۔ میرے ساتھ بہت دیر تک رہا تھا۔ ان دونوں کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ خاص طور پر اُس کے لئے جو پہلی بار تھانے آیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے باپ بھی آگئے۔ میں نے باپوں کو تسلی دی کہ ان کے بیٹوں کو مشتبہ نہیں بٹھایا جا رہا، ان سے کچھ معلوم کرنا ہے۔

"جنابِ والا!"— ایک کے باپ نے کہا — "میں نے اپنے بیٹے کو سو بار منع کیا تھا کہ اس لڑکے کا ساتھ چھوڑ دو، لیکن لڑکے بالے ہماری کب سُنتے ہیں۔"

"آپ کیوں اپنے بیٹے کو اس کی دوستی سے روکتے ہیں؟"— میں نے کہا۔

"کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں جنابِ والا!"— اُس نے جواب دیا — "کون سی بدی ہے جو اس لڑکے (شبیر) میں نہیں۔ باپ بے چارہ لاچار ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ بیٹا ماں کے قبضے میں ہے اور ماں نے بیٹے کو شہزادہ بنا رکھا ہے۔"

"لڑکے کی ماں کیسی عورت ہے؟"— میں نے پوچھا — "سُنا ہے چال چلن کی ایسی ویسی ہے۔"

"باتیں تو بہت مشہور ہیں لیکن سچی ایک بھی نہ ہو شاید"— اُس نے جواب دیا — "خوبصورت عورت ہے، اس لئے بدنام ہو گئی ہے۔ سنا ہے اپنے گاؤں میں اس کا کسی کے ساتھ دوستانہ ہے۔ اکثر گاؤں گئی رہتی ہے۔ بیٹے کو بھی ساتھ لے جاتی ہے لیکن جنابِ والا! میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہتا، البتہ یہ یقین ہے کہ اپنے خاوند کو اس نے اپنے پاؤں میں بٹھا رکھا ہے۔"

"بہت سیدھا آدمی ہے جی!" — دوسرے نے کہا۔

میں نے ان سے کچھ معلومات حاصل کرلیں اور انہیں تسلی دلاسہ دیا کہ وہ اپنے لڑکوں کے متعلق بے فکر رہیں اور گھروں کو چلے جائیں۔ انہیں جلدی گھر بھیج دیا جائے گا۔

انہیں رخصت کرکے میں لڑکوں کے پاس آیا۔ ان کے دلوں سے تھانے کا خوف نکالا اور ایک لڑکے کو میں اپنے دفتر میں لے گیا۔ اس سے پوچھا کہ وہ شبیر (دکاندار کے بیٹے) کے ساتھ فلم دیکھنے جایا کرتا تھا؟ — اُس نے ہاں میں جواب دیا، پھر اُس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی اور دوسرے لڑکے کی جو باہر بیٹھا ہوا تھا، شبیر کے ساتھ گہری دوستی ہے۔ شبیر ان دونوں کو کبھی کبھی شہر فلم دکھانے کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرے۔ اُس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ اُسے باہر بھیج کر دوسرے لڑکے کو بلایا اور اسے کہا کہ اس کا دوست شبیر کی ساری باتیں سُنا گیا ہے، اب وہ سنائے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ کچھ بھی نہ چھپائے اور وہ کچھ چھپا سکے گا بھی نہیں۔

اُس نے اپنے دوست کے بیان کی تائید کردی۔ ان دونوں نوجوانوں نے ایک ہی جیسی باتیں بتائیں۔ ان کے اندر جو باتیں رہ گئی تھیں، وہ میں نے اپنی اُستادی سے نکال لیں۔ ان کا اختصار یہ ہے کہ شبیر عیاش طبیعت کا نوجوان تھا۔ اُس کے یہ دونوں دوست اُس کے ہمراز تھے۔ وہ چوری چھپے سگریٹ پیتا تھا۔ اُسے ماں پیسے دیا کرتی تھی۔ شہر میں عصمت فروشوں کے بازار میں بھی جاتا تھا۔ باپ سے نفرت کرتا تھا۔ ماں سے بہت پیار کرتا تھا۔ جوا بھی کھیل لیتا تھا۔ دوستوں کو پیسے کھلاتا تھا۔

ان دونوں نے بتایا کہ واردات کی شام وہ جہاں کہیں بھی گیا ہے، انہیں بتا کر نہیں گیا۔ میرے پوچھنے پر ایک نے بتایا کہ شبیر کو اُس نے آخری بار بارہ اور ایک بجے کے درمیان دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

"کبھی اکیلا شہر گیا تھا؟"

"میرا خیال ہے وہ اکیلا کبھی نہیں گیا" — اُس نے جواب دیا — "ہم دونوں کے بغیر کبھی نہیں گیا تھا۔"

"اگر اُس کے ساتھ کوئی بات ہوئی تھی تو کیا تم نے محسوس کیا تھا کہ اُس کا مزاج کیسا تھا؟... تم نے ایسا شک کیا تھا کہ وہ تم دونوں کو بتائے بغیر کہیں جا رہا ہے؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے بالکل محسوس نہیں کیا کہ وہ کہیں جا رہا ہے یا وہ پریشان ہے۔ وہ ہر روز کی طرح لگتا تھا۔"

عجیب انکشاف

ان لڑکوں نے دو انکشاف کئے۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکا چوروں کے تعاقب میں گیا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے میں نے اس کی دلیری کی تعریف کی تو اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ چوروں کے قریب پہنچ بھی گئے مگر وہ ٹرنک پھینک کر بھاگ گئے۔ میں نے کہا کہ تم اتنی جلدی باہر نکلے کر چوروں تک جا پہنچے۔

"یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے محلّے کا ایک آدمی اپنی چھت پر تھا اور چاندنی تھی" — اُس نے کہا — "اُس نے چوروں کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ اگر ہم چوکیدار کے کہنے پر جاتے کہ چور کدھر گئے ہیں تو ہم کسی اور طرف نکل جاتے اور چور ٹرنک بھی لے جاتے۔"

"چوکیدار نے کیا کہا تھا؟" — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہم شبیر کے باپ کے پکارنے پر نکلے تو چوکیدار گلی کے آخر میں کھڑا تھا" — اُس نے جواب دیا — "چوکیدار نے ایک اور طرف اشارہ کرکے کہا کہ اُدھر گئے ہیں۔ عین اُس وقت ہمارا وہ دوست باہر نکلا

جس نے چھت سے چوروں کو نالے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اُس نے کہا — "میرے پیچھے آؤ۔ اُدھر گئے ہیں،" — اُس کے پاس ہاکی سٹک تھی۔ ہم سب اُس کے پیچھے گئے اور چوروں تک جا پہنچے۔"

"چوکیدار بھی تمہارے ساتھ تعاقب میں گیا ہوگا؟"

"ہم چار آگے آگے تھے" — اُس نے جواب دیا — "ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ ہمارے پیچھے کون آیا تھا۔ چوروں نے ٹرنک پھینک دیئے۔ ہم کچھ دُور تک اُن کے پیچھے گئے۔ وہ دُور نکل گئے تو ہم واپس آ گئے اور جب ہم ٹرنکوں کے پاس پہنچے تو وہاں شبیر کا باپ اور کچھ آدمی کھڑے تھے اور چوکیدار بھی وہاں کھڑا تھا۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ ٹرنک یہیں رہنے دو اور ابھی تھانے چلو۔ چوکیدار نے کہا کہ خدا کا شکر ادا کرو چور مال پھینک گئے ہیں۔ یہ اُٹھاؤ اور گھر چلو۔ تھانے جا کر کیا کرو گے۔ شبیر کے باپ نے کہا کہ ابھی تو مجھے گھر جا کر دیکھنا ہے کہ وہ اور کیا لے گئے ہیں۔ چوکیدار نے کہا کہ اُن کے پاس جو کچھ تھا، وہ پھینک گئے ہیں۔ میں تمہیں پولیس کے چکّر سے بچانا چاہتا ہوں۔ تھانیدار تمہیں ہر وقت تھانے بٹھائے رکھے گا....

"محلّے کے ایک آدمی نے کہا کہ ٹرنک یہیں پڑے رہنے دو۔ ان پر پہرہ بٹھاؤ اور گھر چل کے دیکھو اور کیا گیا ہے۔ اس دوران محلّے کے کئی اور آدمی آ گئے تھے۔ انہوں نے دو آدمیوں کو ٹرنکوں کے پاس کھڑا کیا اور شبیر کے گھر گئے۔ شبیر کی ماں نے بتایا کہ رضائیوں والی پیٹی میں سے سُوٹ کیس بھی نکل گیا ہے اور سُوٹ کیس میں زیورات اور نقدی تھی۔ سب اپنی اپنی رائے اور مشورہ دے رہے تھے کہ تھانے ابھی چلیں یا صبح ہو لینے دیں۔ صبح ہونے میں تھوڑا ہی وقت تھا۔"

"چوکیدار سے تم لوگوں نے نہیں پوچھا کہ چوری کے وقت وہ کہاں تھا؟"

"وہاں جتنے آدمی تھے ان سب نے چوکیدار کو بُرا بھلا کہا کہ اُس کی موجودگی میں چوری ہوتی ہے" — اُس نے کہا — "اور وہ سویا ہوا تھا۔

چوکیدار نے کہا کہ اس کا علاقہ زیادہ ہے، وہ دوسری گلی میں تھا۔"

پہلے روز میں نے تعاقب کرنے والے ان چاروں آدمیوں کے بیان لئے تھے تو مجھے کوئی شک نہیں ہوا تھا کہ چوکیدار نے انہیں گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ چوکیدار کو تو میں اپنا آدمی سمجھتا تھا۔ میں نے اس کا بیان لکھا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے اب ذہن میں یہ بھی محفوظ کر لیا کہ مجھے چوکیدار کو لپیٹ میں لینا ہے۔ اسے بہت دنوں کی ڈھیل مل چکی تھی۔ میں نے اُسی وقت اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ چوکیدار کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے اس کے پیچھے ایسا آدمی لگا دے جسے چوکیدار نہ جانتا ہو کہ یہ ہمارا مُخبر ہے۔

نوجوان بیوہ کی دوستی

اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آنے لگی۔

دوسرا انکشاف اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ میں ان لڑکوں سے شبیر کے چال چلن وغیرہ کے متعلق کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔ پتہ چلا کہ ایک ہندو لڑکی کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات ہندوؤں کی دو بڑی ہی قبیح رسموں کا نتیجہ تھے۔ ایک یہ کہ ہندو کم عمری میں لڑکیوں کی شادیاں کر دیا کرتے تھے۔ بارہ تیرہ سال کی لڑکی کو جوان کہا کرتے تھے۔ دوسری رسم یہ تھی کہ ہندو عورت بیوہ ہو جاتے تو اس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب پڑھے لکھے ہندوؤں میں جنہوں نے نئی تہذیب کو قبول کر لیا ہے، یہ رسمیں نہیں رہیں لیکن کٹّر ہندو اور دیہاتی ہندو آج بھی ان رسموں کی پابندی سختی سے کرتے ہیں۔

اس لڑکی کی شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ ایک ہی سال بعد اُس کا خاوند مر گیا۔ وہ نوجوانی میں بیوہ ہو گئی۔ اُس کی جوانی کی امنگوں پر مہر ثبت ہو گئی۔ اُس کی چوڑیاں توڑ دی گئیں اور اُس کی سہیلیوں کو

اُس سے ملنے سے منع کر دیا گیا۔ اس کا باپ خوشحال دکاندار تھا۔ لڑکی کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اُس کی دو بڑی بہنیں تھیں۔ دونوں شادی شدہ تھیں۔ مجھے اس بیوہ لڑکی کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ بیوگی کے صرف چھ مہینے اُس نے صبر کیا۔ اس کے بعد وہ انسانی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔ اس مجبوری میں انتقام اور احتجاج کا جذبہ بھی شامل تھا — لڑکی نے اپنی تسکین کی راہ نکال لی۔

شبیر خوبصورت نوجوان تھا۔ اُس کی نظر لڑکی پر اور لڑکی کی اُس پر پڑی اور ان کی در پردہ دوستی ہو گئی۔ لڑکی دلیر ہو گئی۔ شبیر کے ساتھ اُس کے تعلقات چلتے رہے۔ ان دونوں لڑکوں نے مجھے بتایا کہ لڑکی نے شہر کے ایک مسلمان امیر زادے کے ساتھ بھی دوستی کر لی۔ اُس کا نام صغیر تھا۔ امیر زمیندار کا بیٹا تھا۔ باپ مر چکا تھا۔ خود شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ وہ اُس قسم کے بدمعاشوں میں سے تھا جو بدمعاش ہوتے ہوئے بدمعاش نہیں کہلاتے۔ لوگ مُنہ پر ان کی عزّت کرتے اور پیٹھ پیچھے سرگوشیوں میں انہیں بدمعاش کہتے ہیں۔ صغیر کی بدمعاشی پر بھی اُس کی زمینداری اور پیسے نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ مسجدوں میں دل کھول کر چندہ دیا کرتا تھا۔

"تو کیا یہ ہندو لڑکی بیک وقت شبیر اور صغیر کے ساتھ دوستی نبھا رہی تھی؟"

"تین کے ساتھ" — ایک لڑکے نے جواب دیا — "ایک ہندو جوان بھی لڑکی کا دوست تھا لیکن یہ آدمی دوستی سے دستبردار ہو گیا تھا کیونکہ صغیر نے اُس کی پٹائی کرا دی تھی۔"

"وہ شبیر کی بھی پٹائی کرا سکتا تھا" — میں نے کہا۔

"شبیر نے ہم دونوں کو بتایا تھا کہ صغیر نے اُسے کئی بار دھمکی دی ہے کہ لڑکی کی دوستی ترک کر دے" — اُس نے بتایا — "لیکن شبیر خود بڑا دلیر لڑکا ہے۔ اُس نے صغیر سے کہا کہ میں ہندو نہیں ہوں کہ مار کھا کر

بھاگ جاؤں گا۔ مجھے پٹواؤ گے تو میرے آدمیوں کے ہاتھوں ایسے پٹو گے کہ چھ مہینے چارپائی سے اُٹھ نہیں سکو گے.... ہم دونوں نے شبیر سے کہا تھا کہ صغیر کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں، وہ ایک لڑکی کے پیچھے ایسے آدمی کے ساتھ دشمنی نہ رکھے۔ شبیر نے کہا تھا کہ وہ اب تک مجھ پر ہاتھ کیوں نہیں اُٹھا سکا؟ صرف اس لئے کہ اُسے معلوم ہے کہ میرے آدمی کون ہیں اور وہ کیا کر سکتے ہیں۔"

"اُس کے آدمی کون ہیں؟"

"یہ اُس نے نہیں بتایا" — ایک لڑکے نے کہا — "ہم نے اُس سے پوچھا تھا۔ اُس نے نہیں بتایا۔ یہ ایک ہی راز ہے جو اُس نے ہم سے چھپا کر رکھا ہے.... چوری کی واردات سے دو تین دن پہلے بھی صغیر اور شبیر کی تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی تھی۔ شبیر نے ہمیں بتایا کہ صغیر نے اُسے دھمکی دی ہے کہ وہ لڑکی کی دوستی سے اگر باز نہ آیا تو وہ اس سے ایسا انتقام لے گا کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا، اور وہ اسے قتل بھی کرا سکتا ہے۔"

اس انکشاف سے میرا شک صغیر پر مرکوز ہو گیا۔ یہ چوری اس نے اپنے آدمیوں سے انتقام کے طور پر کرائی ہے اور اس واردات میں چوکیدار بھی شامل ہے۔ واردات کرنے والے صغیر کے مزارعے ہی ہو سکتے تھے — لیکن گھر بھیدی کون تھا؟

مجھے یہ بھی نظر آنے لگا کہ شبیر کو صغیر نے اغوا کرایا ہے اور ہو سکتا ہے لڑکا قتل ہو چکا ہو — مگر اس سوال نے میرے اس شک کو بے بنیاد قرار دے دیا کہ شبیر کی ماں اپنے بیٹے کی اتنی لمبی غیر حاضری سے پریشان کیوں نہیں اور اُس نے اپنے خاوند کو تھانے میں بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ دینے سے روکا کیوں تھا؟

میں نے صغیر سے براہِ راست پوچھ گچھ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مُخبروں سے پوچھنا بہتر تھا۔ مجھے یہ شک بھی ہونے لگا کہ شبیر کو اگر صغیر نے اغوا

یا قتل نہیں کیا تو شبیر ہندو لڑکی کو ساتھ لے کر کہیں چلا گیا ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ یہ لڑکی گھر میں ہے یا لاپتہ ہے۔ مخبروں سے پتہ کروایا۔ رات تک مجھے پتہ چل گیا کہ لڑکی یہیں ہے بلکہ ایک رات پہلے اُسے صغیر کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔ صغیر کے متعلق مخبروں نے بتایا کہ اس ہندو لڑکی کے ساتھ اُس کے گھر سے تعلقات ہیں۔ صغیر کی بیوی پردے میں رہنے والی سیدھی سی عورت ہے۔ صغیر کی حویلی کا ایک خاص کمرہ ہے۔ لڑکی اس کمرے میں جاتی ہے۔

ہندو مُخبروں نے جن میں نمبردار بھی شامل تھا، مجھے بتایا ــــ "آپ نے یہ تو سوچا ہو گا کہ یہ ہندوؤں کا شہر ہے اور ہندو جانتے ہیں کہ ان کی لڑکی کے تعلقات ایک مسلمان کے ساتھ ہیں، پھر ہندو کیوں نہیں بولتے؟ ہندوستان میں مسلمانوں پر ہندو حملے کرتے رہتے ہیں، یہاں اس لڑکی کے معاملے میں وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتے؟ ــــ اس کی ایک وجہ ہے۔ کیسری (بیوہ لڑکی) کے باپ کو اپنی جاتی کے لوگوں نے بتایا تھا کہ اُس کی بیٹی دو مسلمانوں سے ملتی ملاتی ہے اور معاملہ گڑبڑ ہے۔ باپ نے کیسری کو روکا تو بیٹی اُس پر اور اپنی ماں پر لوٹ پڑی۔ اُس نے ان کی بے عزتی کی اور یہاں تک کہہ گئی کہ اس عمر میں تم میری چوڑیاں توڑ کر مجھے گھر میں قید کر لو گے؟ سارے محلے نے لڑکی کی واہی تباہی سُنی۔ اُس نے ماں باپ کو دھمکی دی کہ اُسے گھومنے پھرنے سے روکا گیا تو وہ ان دونوں میں سے کسی مسلمان کے ساتھ گھر سے بھاگ جائے گی .... اور جناب! اُس نے ایک روز اپنے ماں باپ سے یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے زیادہ پریشان کرو گے تو میں دلی کے بازار میں جا بیٹھوں گی۔"

"تو اُسے پریشان کیا جاتا رہا ہو گا" ــــ میں نے کہا۔

"صرف پریشان نہیں جناب!" ــــ مُخبر نے جواب دیا ــــ "یہ معاملہ مندر تک پہنچا۔ ہمارے پنڈت جی نے کہا کہ لڑکی کو مندر میں بھیج دیا جائے تاکہ اُسے گنگا جل (پانی) سے پوتر (پاک) کیا جائے اور اُس

کے دماغ سے مسلمانوں کی دوستی نکالی جائے۔ لڑکی مندر میں گئی۔ دوسرے دن اُس نے گھر میں طوفان کھڑا کر دیا۔ آپ شاید جانتے ہوں گے کہ یہ پنڈت اندر سے کیا ہیں۔ اس پنڈت نے پہلے دن ہی لڑکی پر اپنی نیت ظاہر کر دی۔"

میرا یہ ہندو مُخبر نام کا ہندو تھا۔ جواری اور چرسی تھا۔ ہندوؤں کی زندگی کے ڈھکے چھپے گوشوں سے واقف تھا۔ بھگوان سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ ویسے ہی تھا جیسے مسلمان جرائم پیشہ برائے نام مسلمان ہوتے ہیں۔ کیسری کو پنڈت نے مندر میں بلایا تو وہ یہ تاثر لے کر آئی کہ پنڈت جی مہاراج شبیر اور صغیر کی قماش کے ہی آدمی ہیں۔ اُس نے گھر آ کر بہت شور شرابا کیا۔

مُخبر کے کہنے کے مطابق پنڈت نے یہ مشورہ بھی دیا کہ لڑکی کو ہردوار بھیج دیا جائے جہاں جوان بیوہ لڑکیوں کو تنہائی کی زندگی گزارنے کے لئے رکھا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر لڑکی نے کہا تھا کہ وہ دلی کے بازار میں جا بیٹھے گی۔ وہ چوڑیاں پہنتی ہے۔ زیور بھی اُس نے نہیں اُتارا اور بیواؤں کی طرح سفید اور میلا دوپٹہ قبول نہیں کرتی۔

شبیر کے دوستوں نے مجھے بتایا تھا کہ لڑکی تحفوں اور پیسوں کی شوقین ہے اور شبیر اُسے دونوں چیزیں دیتا رہتا ہے۔

مُخبر نے وثوق سے بتایا کہ کیسری گھر میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ شبیر اُسے ساتھ لے کر کہیں غائب ہو گیا ہے لیکن یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے کسی لڑکے کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں دی گئی تھی اور ایسی رپورٹ بھی میرے پاس نہیں آئی کہ شبیر اور صغیر نام کے دو مسلمان ایک ہندو بیوہ کو ورغلاتے اور اُسے خراب کرتے ہیں۔ میں ان کے تعلقات کی گہرائی میں صرف اس لئے جا رہا تھا کہ ان کا تعلق چوری کی واردات کے ساتھ ہے یا نہیں۔ البتہ شبیر کی گمشدگی میرے لئے قابلِ غور تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ چوری الگ واردات ہو گی اور شبیر کا اغوا (اور شاید قتل) الگ واردات ہو گی۔ مجھے کچھ ایسا شک بھی ہونے لگا تھا کہ شبیر کو ہندوؤں نے ہی غائب نہ کر دیا ہو، اور یہ بھی ممکن تھا کہ چوری انہوں نے

ہی کرائی ہو۔ صغیر کے بھی کیسری کے ساتھ تعلقات تھے۔ ہندوؤں کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے میں نے صغیر سے بات کرنا ضروری سمجھا۔ اُسی وقت اُسے تھانے لانے کے لیئے ایک کانسٹیبل بھیجا۔

ہندوؤں کی دھمکی

صغیر بڑے رعب سے تھانے میں آیا۔ میں نے اُس کا رعب قائم رکھا اور بڑے احترام سے اُسے ذہن نشین کرا دیا کہ اُس کے رعب پر تھانے کا رعب غالب رہے گا۔ میں نے کیسری کی بات چھیڑ دی اور اُسے یہ تاثر دیا کہ یہ کوئی جرم نہیں ہیں نے ہندوؤں کو بُرا بھلا کہا اور صغیر سے پوچھا کہ ہندوؤں کا ردِ عمل کیا ہے۔

"آپ یہ بات کس سلسلے میں پوچھ رہے ہیں؟" — اُس نے پوچھا۔

"تم جانتے ہو کہ مسلمانوں کے محلے میں ایک گھر میں چوری ہو گئی ہے" — میں نے کہا — "یہ چوری کسی گھر بھیدی نے کرائی ہے اور یہ چوری انتقامی کارروائی معلوم ہوتی ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ ہندوؤں نے کرائی ہے۔ تم جانتے ہو کہ کیسری کے ساتھ شبیر کی بھی دوستی ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوؤں نے تمہیں کبھی اس لڑکی سے نہ ملنے کے لئے کہا ہے یا کبھی دھمکی دی ہے؟"

"ہندو اگر مجھے دھمکی دیتے تو آپ کے پاس دو تین زخمی ہندو آتے اور میں آپ کی حوالات میں ہوتا" — اُس نے جواب دیا اور ایک ہندو رئیسِ شہر کا نام لے کر کہا — "اُس نے مجھے دو یا تین بار کہا تھا کہ اس لڑکی کی بدکاری کی وجہ سے شہر کے تمام ہندوؤں کی بے عزتی ہو رہی ہے اور میں اس سے تعلقات توڑ لوں۔ میں نے اُسے ہر بار یہ ایک ہی جواب دیا کہ جس روز ہندو مجھے اس لڑکی کو ورغلاتا یا اُس کے دروازے پہ کھڑا اور اُسے اپنے ساتھ لے جاتا دیکھ لیں، اُسی روز مجھے قتل کر دیں۔ لڑکی خود میرے گھر آتی ہے۔

میں اپنی زمین پر جاتا ہوں تو کبھی کبھی وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔"

"شبیر کے ساتھ ہندوؤں کا رویہ کیا تھا؟"

"میں صاف الفاظ میں کچھ نہیں بتا سکتا" — اُس نے کہا — "کیونکہ میں کچھ نہیں جانتا۔ ایک بات یاد آتی ہے۔ ایک بار تین ہندوؤں نے مجھے دوستانہ لہجے میں یہی بات کہی تھی جو یہ ہندو رئیس مجھے کہہ چکا تھا۔ میں نے ان ہندوؤں سے کہا کہ تمہاری لڑکی کی دوستی صرف میرے ساتھ نہیں تمہاری لڑکی اور طوائفوں میں یہ فرق ہے کہ یہ اپنے گھر میں ہے بازار میں نہیں جا بیٹھی۔ میں نے ہندوؤں سے کہا کہ یہ میرا کمال ہے کہ میں نے کیسری کے بہت سے یارانے توڑ دیئے ہیں۔ صرف شبیر رہ گیا ہے۔ اسے لڑکی چھوڑنا نہیں چاہتی۔ ایک ہندو نے کہا — اُسے ہم سنبھال لیں گے۔ یہ لڑکا اس شہر سے بھاگ جائے گا" — میں نے شبیر سے کہہ دیا تھا کہ تم میرے ہاتھ سے بچ گئے تو ہندو تمہیں نہیں چھوڑیں گے، لیکن لڑکا دلیر ہے۔ نہ مجھ سے کبھی ڈرا ہے نہ ہندوؤں سے۔"

"تم نے کیسری سے بھی کہا ہو گا کہ وہ شبیر سے نہ ملا کرے۔"

"ملک صاحب!" — اُس نے کہا — "آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپا رہا۔ میں یہ بتانے سے بھی نہیں جھجکوں گا کہ میں نے کیسری سے کئی بار کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ تعلق رکھنا چاہتی ہے تو شبیر کے ساتھ تعلق توڑ لے۔ کبھی وہ سنجیدہ ہو جاتی اور کبھی ہنسنے لگتی تھی۔ اُس نے شبیر کے ساتھ تعلق قائم رکھا۔"

میری نظر میں صغیر بھی مشتبہ تھا۔ اُس میں اتنی ہمت اور طاقت تھی کہ اپنے آدمیوں سے چوری کرا دیتا، لیکن میں اُس پر براہِ راست حملہ کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے اُسے دوست بنا لیا تھا اور دوستانہ بے تکلفی سے باتیں ہو رہی تھیں۔ میں اُسے بڑی اُستادی سے واردات کی طرف

لارہا تھا اور اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور انداز کی تبدیلیوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ چوری اگر ہندوؤں نے کروائی ہے تو میرے اور تمہارے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم ہندوؤں کو بخش دیں۔

"اللہ کی قسم ہے ملک صاحب!" ___ صغیر نے کہا ___ "میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ شبیر کے ساتھ میرے تعلقات کتنے کشیدہ ہیں لیکن اُس کے گھر میں چوری کو میں برداشت نہیں کر سکا۔ آپ کی طرح یہ شک میرے دل میں بھی آیا تھا کہ چوری ہندوؤں نے انتقاماً کرائی ہے میں اُن لڑکوں سے مل چکا ہوں جو چوروں کے پیچھے گئے تھے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ چوکیدار نے انہیں کسی دوسرے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ معلوم نہیں اُنہوں نے یہ بات آپ کو بتائی ہے یا نہیں۔ میں چوکیدار کو یہاں تک کہہ چکا ہوں کہ اُسے اچھی طرح معلوم ہے اور اُس نے سراغ نہ دیا تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میرے پاؤں میں گر پڑا تھا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ یہی ہو گا کہ مجھے چوروں کا سراغ دے گا یا یہاں سے بھاگ جائے گا۔"

یہ سُن کر مجھے فکر ہُوا کہ یہ شخص چوکیدار کو بھگا دے گا۔ چوکیدار تو میرا مشتبہ نمبر ایک بن چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ تسکین ہوئی کہ یہ واردات صغیر نے نہیں کرائی۔

"صغیر بھائی!" ___ میں نے اُسے کہا ___ "چوکیدار کو بھگا نہ دینا۔ اُسے میں نے جان بُوجھ کر ڈھیل دے رکھی ہے۔ اُس کے ساتھ اب بات کرنی چھوڑ دو۔ اُس سے لاتعلق ہو جاؤ۔ میں خود اُسے گھیروں گا۔ وہ دراصل ہے ہی میرے گھیرے میں۔"

میں نے یہ بات کہہ تو دی لیکن مجھے تاسف ہونے لگا کہ صغیر کو میں نے اس راز میں شریک کر کے غلطی کی ہے۔ ہو سکتا ہے چوکیدار اسی کا آدمی ہو۔ میں نے اُسے اور زیادہ ہوا دینی شروع کر دی اور یہ دیکھنے لگا کہ صغیر کہاں تک سچ بول رہا ہے۔ مجھے یقین سا ہونے لگا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ

ہے۔ تاہم میں محتاط رہا اور اس کے دل سے بات نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔

رات میرے پاس آئی تھی

"شبیر کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو کہاں غائب ہو گیا ہے؟" ___ میں نے پوچھا ___ "میرا خیال تھا کہ وہ کیسری کو کہیں بھگا لے گیا ہے۔"

"کیسری یہیں ہے" ___ صغیر نے جواب دیا ___ "پرسوں رات میرے پاس آئی تھی۔ شبیر کے متعلق میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر مجھے کبھی کبھی افسوس ہُوا کرتا ہے۔ اتنا خوبصورت لڑکا جو دلیر بھی ہے تباہ ہو گیا ہے۔ اس کا باپ بہت سیدھا آدمی ہے۔"

"میں نے سُنا ہے لڑکے کو ماں نے بگاڑا ہے" ___ میں نے پوچھا ___ "ماں کیسی عورت ہے؟"

"میں آپ کو ایک بات سُنا دیتا ہوں" ___ صغیر نے جواب دیا ___ "آپ خود رائے قائم کر لیں کہ وہ کیسی عورت ہے۔ میں اسے بہت اچھی عورت کہا کرتا ہوں کیونکہ وہ جسے چاہتی ہے اُس کے ساتھ پوری وفاداری کرتی ہے۔"

"صغیر بھائی!" ___ میں نے اُسے کہا ___ "دل سے یہ نکال کر بات کرنا کہ شبیر کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے۔"

"دشمنی شبیر کے ساتھ ہو گی" ___ اُس نے کہا ___ "اُس کی ماں کے ساتھ نہیں اور اُس کے باپ کے ساتھ بھی میری کوئی دشمنی نہیں، بلکہ مجھے ان کے ساتھ ہمدردی ہے۔ آپ میری بات سُن لیں.... جب آپ شبیر کو دیکھیں گے تو آپ فوراً کہہ اُٹھیں گے کہ یہ لڑکا اس ماں کا بیٹا تو ہے لیکن اس گول گپے اور ٹھنگنے سے آدمی کا بیٹا نہیں جو اُس کی ماں کا خاوند ہے۔ اُس نے اپنے باپ کی ذرا سی بھی جھلک نہیں۔ جس باپ کی جھلک ہے اُسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟"

"آپ اُسے نہیں جانتے" — صغیر نے جواب دیا — "وہ میری طرح جاگیردار کا بیٹا ہے، بلکہ اُس کی زمین مجھ سے زیادہ ہے۔ روپے پیسے میں بھی مجھ سے زیادہ طاقت رکھتا ہے۔ بہت خوبصورت آدمی ہے اور دل گُردے والا مرد ہے۔ جیسی خوبصورت جمیلاں (شبیر کی ماں) ہے ویسا ہی خوبصورت وہاب ہے۔ اُس کے اپنی بیوی سے جو بچے ہیں وہ بھی شبیر کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہ قصہ مجھے یوں پتہ چلا کہ جمیلاں بیاہی ہوئی یہاں آئی تو اُس نے پردہ نہ کیا۔ یہ سترہ اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ انیس سال تھی، اور میری شادی ہو چکی تھی جمیلاں کا دولہا اُس وقت بھی ایسا ہی تھا جیسا اب ہے۔ بھدّا، بدصورت، کالا، رنگ اور پیٹ بڑھا ہُوا۔ یہ جوڑ برادری نے ملایا تھا...

"ہم نے جمیلاں کو دیکھا تو اس کی خوبصورتی نے حیران کر دیا۔ میں اُس وقت آج کی نسبت ذرا زیادہ ہی شہزادہ ہُوا کرتا تھا۔ یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی اِس آدمی کے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کسی نواب کی بیٹی ہے۔ میں اپنے آپ کو نواب کا بیٹا سمجھا کرتا تھا۔ میں نے جمیلاں تک رسائی حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اُسے آتے جاتے اشارے کئے۔ ایک عورت کو پیغام رسانی کے لئے استعمال کیا۔ تحفے بھیجے۔ سونے کی انگوٹھی بھیجی مگر اُس نے مجھے قبول نہ کیا۔ اُس کی شادی کے ابھی آٹھ مہینے پورے نہیں ہُوتے تھے کہ شبیر پیدا ہُوا۔ مشہور ہو گیا کہ جمیلاں یہ بچّہ اپنے گاؤں سے لائی تھی۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ جمیلاں شریف لڑکی نہیں۔ میں اور زیادہ اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ دو اڑھائی سال گُذر گئے...

"وہ میری بے تابی اور منت سماجت اور تحفوں سے اتنی متاثر ہوئی کہ ایک روز میری اُس سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور آپ سُن کر حیران ہوں گے کہ اُس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ میں اُسے کھیتوں میں فلاں جگہ ملوں۔ میں تو ایسے گیا جیسے سَر کے بل جاتے ہیں

مگر اُس نے باتیں کیں تو مجھے اپنی مردانگی، جوانی اور دولت پر جو ناز تھا اُس پہ اوس پڑ گئی۔"

صغیر نے مجھے بڑی لمبی بات سنائی تھی۔ میں اسے مختصر کر کے سناتا ہوں۔ جمیلاں نے اُسے کہا کہ میں مانتی ہوں کہ تم خوبصورت جوان ہو اور میرا خاوند کسی پہلو میرے لئے قابلِ قبول نہیں۔ وہ میری روحانی اور جسمانی تسکین کے بھی قابل نہیں۔ اگر تم میرے خاوند ہوتے تو مجھے خوشی ہوتی۔ تم نے مجھے بہت قیمتی تحفے بھیجے ہیں جو میں واپس کرتی رہی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس شہر کے امیر زمیندار کے بیٹے ہو اور تم اپنے دشمنوں کو گھٹنوں بٹھا سکتے ہو لیکن میں تمہیں قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے جس کے ساتھ وفا کا وعدہ کیا تھا اُس کے ساتھ وفا کر رہی ہوں۔ اُسے دھوکہ نہیں دوں گی۔

صغیر نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اُس نے اپنے گاؤں کے ایک آدمی کا نام لے کر کہا کہ میں اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن ماں باپ نہیں مانتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ میری منگنی دوسرے آدمی کے ساتھ کر دی گئی۔ تم مجھے جو جی میں کہہ لو، میں نے جسے اپنا خاوند بنانے کی خواہش کی تھی، اُسے در پردہ اپنا خاوند بنا لیا۔ میرے اس بچّے کا باپ وہی ہے۔ اُس کی بھی شادی ہو گئی۔ میں اپنے گاؤں اپنے ماں باپ سے ملنے نہیں، اُسے ملنے جایا کرتی تھی۔

جمیلاں نے صغیر سے کہا کہ اِس آدمی کے ماں باپ کو پتہ چل گیا۔ اُنھوں نے میرے ماں باپ کی بے عزّتی کی اور بیٹے کو اپنی اُس جاگیر میں بھیج دیا جو اُس کے باپ کو سرکار کی طرف سے ملی ہُوئی ہے۔ اس کا باپ فوج میں رسالدار تھا۔ بہت سی زمین اُن کی اپنی تھی۔ دو مربعے سرکار نے دے دیئے اب ہم مل نہیں سکتے۔ کسی روز تو ملیں گے۔ میں دل سے تمہاری قدر کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں دھتکارا نہیں، تمہاری عزّت کی ہے، تم

میری عزت کرو۔

صغیر پھر بھی اُسے پیغام بھیجتا رہا اور جمیلاں اسے بڑے اچھے انداز سے ٹالتی رہی — وقت گزرتا گیا۔ صغیر کی توجہ اپنی بیوی سے ہٹی رہی اور اُس کے دو بچے پیدا ہو گئے — پندرہ سولہ سال گزر گئے اور وہ وقت آیا کہ کیسری کے معاملے میں جمیلاں کا بیٹا اُس کا رقیب بن گیا۔

"چوری کی واردات سے دو اڑھائی ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک بڑا وجیہہ آدمی مجھے ملنے آیا" — صغیر نے کہا — "میری عمر کا ہی تھا۔ اعلیٰ قسم کے گھوڑے پر سوار تھا۔ اُس نے کہا — 'میرا نام وہاب ہے' — مجھے یاد آگیا۔ جمیلاں اسی کو چاہتی تھی اور یہی جمیلاں کے بیٹے شبیر کا باپ تھا۔ چہرہ دلنشیں تھا اور اس پر مردوں والا وقار بھی تھا۔ خدا گواہ ہے، میرے دل نے تسلیم کر لیا کہ جمیلاں کا خاوند یہ آدمی ہونا چاہیئے تھا۔ میں اُسے معزز مہمانوں کی طرح اندر لے گیا اور نوکر کو بلا کر اُسے کہا کہ ٹھنڈا دودھ لے آئے ....

"وہاب نے مسکرا کر کہا — 'مجھے دودھ نہ پلاؤ صغیر دوست! میں جونہی بات کروں گا تم میرے دشمن بن جاؤ گے' — میں نے کہا — 'میں جانتا ہوں تم کیوں آئے ہو۔ کھُل کر بات کرو، اور بات کرنے سے پہلے ہی سُن لو کہ جمیلاں تمہاری ہے' — وہ ہنس پڑا اور ہاتھ میری طرف بڑھا کر بولا — 'تم راجپوت کی اولاد ہو۔ میں تمہیں دیکھنے آیا تھا کہ جمیلاں کا دل اپنی طرف کھینچنے والا کون ہے' — میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ چودہ سال بعد اپنے گاؤں واپس آیا ہے۔ وہ تقریباً دو سو میل دور باپ کے حکم سے جاگیر پر رہا ہے۔ اس دوران وہ گاؤں آتا رہا مگر سال میں ایک دو دفعہ اور وہ بھی ایک ایک دو دو دلوں کے لئے۔ اس دوران اُس پر باپ کی بڑی سخت نگرانی ہوتی تھی ....

"میں نے چونکہ اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے دوستی کا یقین دلا دیا تھا

اس لئے اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ اُس نے مجھے وہی باتیں بتائیں جو جمیلاں مجھے کئی سال پہلے بتا چکی تھی۔ میں نے جمیلاں کو بے حیا نہیں دلیر سمجھا تھا۔ اُس نے مجھ پر ایسا تاثر پیدا کیا تھا کہ اُس کی پوجا کرنے کو جی چاہتا تھا۔ یہی اثر تھا جس کے تحت میں اُسے ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب وہاب نے بھی اُسی دلیری سے بات کی تو میں جمیلاں سے اور زیادہ متاثر ہُوا اور میں نے بڑی اچھی طرح محسوس کر لیا کہ میں اس آدمی کی جگہ نہیں لے سکتا اور میں جو اُس کے پیچھے پڑا رہا ہوں، بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہا ہوں"

صغیر نے بڑی لمبی کہانی شروع کر دی تھی۔ کبھی تو مجھے یہ خیال آتا تھا کہ میرا وقت ضائع ہو رہا ہے اور میں دوسروں کے عشق و محبت سے لُطف اُٹھا رہا ہوں۔ کبھی مجھے یوں لگتا جیسے صغیر کی کہانی اہم اور واضح سراغ دے رہی ہے۔ ایسا مجھے اُس وقت محسوس ہُوا تھا جب مجھے صغیر کی کہانی سُنتے سُنتے یاد آگیا تھا کہ جمیلاں نے اپنے خاوند کو روکا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے نہ دے۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ جمیلاں کے خاوند نے پہلے روز مجھے بیان دیتے ہوئے بتایا تھا کہ جب چور گھر سے سامان اُٹھا کر نکلے تو اُس نے شور مچایا تھا اور جمیلاں نے اُس کے مُنہ پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔ بے شک جمیلاں نے یہ بھی کہا تھا کہ شور نہ کرو، ورنہ چور واپس آ کر قتل کر دیں گے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ عورت دیکھ رہی ہو کہ اُس کا سارا زیور جا رہا ہے اور اُس کا گھر لُٹ گیا ہے تو خاموش نہیں رہ سکتی۔

لیکن سوچنے والی بات یہ تھی کہ کوئی عورت خود اپنے گھر چوری کرا سکتی ہے؟ عام ذہن کا آدمی یہی کہے گا کہ نہیں، مگر میرے سامنے دو واقعات ایسے ہو چکے تھے جن میں دو عورتوں نے اپنے گھر خاوندوں سے نفرت کے تحت لُٹا دیئے تھے۔ میرے سامنے جمیلاں کا کردار نکھرتا آرہا تھا۔ اُس کے بیٹے کا باپ بھی سامنے آگیا تھا اور یہ مجھے ایک انوکھی محبت کی واردات

دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے صغیر کو بولنے سے نہ روکا۔ اُس پر جذبات کا غلبہ تھا اور وہ عجیب سی کیفیت میں کہانی سُنا رہا تھا۔

محبّت اور وفا کی انتہا

"میں جمیلاں سے اتنا زیادہ متاثر تھا کہ کیسری کے معاملے میں شبیر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اُس کا بہت بُرا حال کرتا" —— صغیر نے کہا —— "مجھے آپ نہیں جانتے، شہر کے لوگ جانتے ہیں۔ اب میں آپ کو دل کی ہر ایک بات بتا رہا ہوں تو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں نے شبیر کو دھمکیاں ضرور دی تھیں لیکن میں عملاً کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جمیلاں کا بیٹا تھا۔"

"تم وہاب کی باتیں سُنا رہے تھے" —— میں نے کہا —— "اُس نے تمہیں کیا کہا تھا۔"

"اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا باپ مر گیا ہے اور اب اُسے گاؤں میں آنے اور جمیلاں سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اب اُس نے اپنے باپ کی جگہ لے لی ہے۔ اُس نے چودہ پندرہ سال قید کاٹی ہے۔ اب وہ اور جمیلاں جوان نہیں رہے لیکن اُن کی محبّت جوان ہے۔ اُسے قید میں رکھنے کا حکم باپ نے دیا تھا۔ وہ بڑا جابر آدمی تھا۔ وہاب اُس سے ڈرتا بھی تھا اور اُس کی بہت عزت کرتا تھا۔ باپ نے اتنی زیادہ جاگیر اُس کے نام کر دی تھی۔ باپ کی تو وہ عزّت کرتا تھا اس لئے اُس کے حکم کا پابند رہا، اُسے غصہ اپنی بیوی پر تھا جو اُس پر حکم چلاتی رہی ہے اور بعض اوقات وہ اُس کے ساتھ اس طرح بات کرتی تھی جیسے وہاب اُس کا زرخرید غلام ہو۔ وہاب نے مجھے بتایا کہ اُس کی بیوی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ اب دیکھوں گی تم جمیلاں سے کس طرح ملتے ہو....

"باپ کے مرنے کے بعد وہاب آزاد ہو گیا۔ وہ باپ کی وفات پر اپنے

گاؤں آیا۔ جمیلاں شہر میں تھی۔ وہاب نے اُسے پیغام بھیجا کہ باپ فوت ہو گیا ہے۔ جمیلاں اطلاع ملتے ہی گاؤں گئی اور بہت سارا وقت وہاب کے گھر گزارا۔ وہ سات آٹھ روز اپنے گھر رہی اور وہاب سے تنہائی میں ملتی رہی۔ جمیلاں نے وہاب کی محبّت کو زندہ رکھا ہُوا تھا۔ اُس نے وہاب سے کہا کہ وہ اُسے جو بھی حکم دے گا وہ مانے گی۔ وہاب نے کہا کہ حکم یہی ہے کہ اپنے خاوند سے طلاق لے کر آجاؤ۔ وہاب نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جمیلاں نے طلاق لینے کا وعدہ کر لیا....

"اس کے بعد کبھی وہاب شہر آتا اور جمیلاں سے ملتا اور کبھی جمیلاں گاؤں جاتی اور وہاب سے ملتی۔ وہاب کے لئے اپنی بیوی کو طلاق دینا آسان تھا، مشکل جمیلاں کے لئے تھی۔ وہ طلاق نہیں لے سکتی تھی۔ وہاب نے اُسے یہ طریقہ بتایا کہ وہ خاوند کو پریشان کرتی رہے اور اُس کے ساتھ بول چال بند کر دے۔ جمیلاں نے خاوند کے ساتھ ایسا ہی سلوک شروع کر دیا۔ شبیر بھی ماں کے کہنے پر باپ سے کھچا کھچا رہنے لگا۔ جمیلاں کے خاوند نے دونوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے اور جمیلاں کا غلام بن گیا۔ آخر اُس نے تنگ آکر جمیلاں کے ماں باپ سے جا شکایت کی۔ ماں باپ نے شہر آکر جمیلاں کو بُرا بھلا کہا لیکن جمیلاں پر کچھ اثر نہ ہُوا....

"وہاب نے مجھے کہا کہ جمیلاں نے اُسے بتایا کہ شہر میں صغیر نام کا ایک زمیندار ہے جو اُسے پریشان کرتا رہتا ہے اور تحفے اور پیغام بھیجتا ہے۔ وہاب کو بہت غصہ آیا۔ وہ مجھے جمیلاں کا خیال ذہن سے نکال دینے کے لئے کہنے آیا تھا کہ تم ہندوؤں کی بیوہ لڑکی اور جمیلاں کو ایک جیسی سمجھتے ہو۔ جمیلاں نے اُسے بتا دیا کہ کیسری کے ساتھ میرے تعلقات ہیں۔ وہاب نے کہا —— 'جمیلاں کا خاوند مر گیا تو بھی وہ بیوہ نہیں ہو گی' —— میں نے اُسے کہا کہ تم اتنے زیادہ دلیر اور اپنی دنیا کے بادشاہ ہو تو جمیلاں کے خاوند کو قتل کیوں نہیں کرا دیتے؟....

"اُس نے کہا —— 'آدمی بھلے مانس ہے۔ مجھے اُس پر رحم آتا ہے۔

وہ خود ہی جمیلاں کو طلاق دے دے تو اچھا ہے'۔۔۔میں نے اُس سے پوچھا کہ جمیلاں نے طلاق لے بھی لی تو وہ اُس کے ساتھ شادی کس طرح کرے گا۔ اُسے برادری روکے گی نہیں؟ اُس نے ہنس کر جواب دیا کہ کبھی میرے گاؤں آنا۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ برادری مجھے کسی کام سے روک سکتی ہے یا میں برادری کو روکا کرتا ہوں۔ اُس نے یہ بھی کہا۔۔۔'اور تم میرے بیٹے (شبیر) کو بھی دھمکیاں دیتے رہے ہو'۔۔۔میں نے اُسے کہا کہ اُس کا بیٹا اسی عمر میں ان بُرے کاموں میں پڑ گیا ہے۔ اگر اُسے سنبھالا نہ گیا تو لڑکا اُس کے کام کا بھی نہ رہے گا۔۔۔وہ صرف ہنس پڑا۔ اُس نے اور کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد ہم دوستوں کی طرح باتیں کرتے رہے اور وہ چلا گیا۔"

"تم نے اُس سے شبیر کے متعلق نہیں پوچھا کہ کہاں ہے؟"۔۔۔میں نے صغیر سے پوچھا۔

"پوچھا تھا"۔۔۔اُس نے جواب دیا۔۔۔"اُس نے بے پرواہی سے کہا تھا کہ خدا جانے۔"

خود ساختہ بادشاہ

صغیر کی اتنی لمبی کہانی سے میں نے یہ اخذ کیا کہ چوری کی واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر کسی بڑے آدمی کا ہی تعلق ہے تو وہاب کا ہو سکتا ہے۔ "بڑے آدمی" کی وضاحت کر دوں تو ہمارے شہری قارئین کے لئے بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ پاکستان کے دیہاتی معاشرے میں بھی وہاب اور صغیر جیسے "بڑے آدمی" پائے جاتے ہیں بلکہ آزادی سے پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں انگریزوں نے خوشامد، چاپلوسی، اپنے بھائیوں کے خلاف مُخبری اور فوجی خدمات کے صلے میں مربعے دیئے تھے۔ کچھ اراضی اُنہوں نے کوڑیوں کے حساب سے خرید لی۔ بعض نے جنگل خرید لئے اور یہ لوگ جاگیردار بن گئے۔

انہوں نے اپنی ریاستیں بھی بنا لیں اور مزارعوں اور غریب کسانوں کے بادشاہ بن گئے۔ ان غریبوں کی بہو بیٹیاں اُن کی لونڈیاں بن گئیں اور یہ جاگیردار اُن کی قسمت کے مالک بن گئے۔ دن دہاڑے گناہ کرتے تھے اور کسی کو قتل کرا دینا اور کسی کے ہاں چوری کرا دینا اور کسی کے مویشی کُھلوا کر غائب کرا دینا اُن کے لئے نہایت آسان تھا۔ علاقے کا تھانیدار، تحصیل دار اور سرکاری اہلکار اُن کے قبضے میں ہوتے تھے۔ پولیس اُن پر ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔ کسی کے خلاف کوئی مقدمہ بن ہی جاتے تو پولیس اُس کی اتنی مدد کرتی تھی کہ مقدمہ تباہ ہو جاتا تھا۔

دیہاتی معاشرے سے یہ قباحت آزادی کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی۔ پاکستان میں ان جاگیرداروں نے صرف تھانیداروں تحصیلداروں پر ہی قبضہ نہ کئے رکھا بلکہ حکومت پر بھی قابض ہو گئے اور ہمیں لیڈر اور وزیر انہی جاگیرداروں میں سے ملنے لگے۔ ان کی بے نام ریاستوں کے کسی فرد کو جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی پسند کے امیدوار کو ووٹ دے سکے۔ تحریکِ پاکستان کے دَور کے لوگ گواہ ہیں کہ ان جاگیرداروں نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت بڑی ڈھٹائی سے کی اور انگریزوں کا نمک حلال کیا تھا۔ میں ان میں سے دو تین کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو پاکستان کے مخالف تھے لیکن پاکستان میں آکر میں نے انہیں وزارتوں کی کرسیوں پر بیٹھے ہُوئے دیکھا اور انہیں میں نے رسّہ گیری اور ڈکیتی کی وارداتیں کراتے بھی دیکھا تھا۔

وہاب انہی جاگیرداروں میں سے تھا۔ میں نے صغیر کے جانے کے بعد چوکیدار اور جمیلاں کے خاوند (دکاندار) کو بلا لانے کے لئے ایک کانسٹیبل کو بھیجا۔ میں نے صغیر سے پوچھا تھا کہ کیا اُسے ایسا شک ہے کہ یہ چوری وہاب نے جمیلاں کے خاوند کو پریشان کرنے کے لئے کرائی ہوگی؟

"ملک صاحب!"۔۔۔صغیر نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔۔۔"اگر میرے پاس پکّا ثبوت ہوتا کہ یہ چوری وہاب نے کرائی ہے تو بھی میں آپ کو نہ بتاتا۔ میں جمیلاں

کامرید ہوں اور وہاب میرا دوست ہے۔ میں اُس کے خلاف کوئی شک نہیں کروں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس شک کی کوئی وجہ نہیں۔ اُس پہلی ملاقات کے بعد ہم دوستوں کی طرح ملتے رہے ہیں۔"

میں نے صغیر سے اور کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔

خاوند کی بے بسی

جمیلاں کا خاوند آگیا۔ چوکیدار کے متعلق کانسٹیبل نے بتایا کہ اُس کے گھر کو تالا لگا ہوا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ اُس نے کہا تھا کہ اُس کی بیوی بچے کی پیدائش کے لئے اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے، شاید وہاں چلا گیا ہو گا۔ میں نے اُس کے میٹ کو بلا لیا۔ اُس سے پوچھا کہ چوکیدار کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اپنے گاؤں گیا ہے، شام تک آجائے گا۔ مجھے اس کے جواب پر کچھ شک سا ہوا جو میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ ابھی جا کر اُس کے گاؤں آدمی بھیجو اور اُسے فوراً حاضر کرو۔ چوکیدار کا گاؤں قصبے سے ڈیڑھ پونے دو میل دُور تھا۔ میں نے اُس کے میٹ کے چہرے پر گھبراہٹ سی دیکھی جو ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

وہ تھانے سے نکلا تو میں نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ کوئی ایسا آدمی اس کے پیچھے لگا دو جسے یہ نہ جانتا ہو۔ میرے دل میں شک پختہ ہو گیا تھا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ چوکیدار کے خلاف مجھے کچھ مواد مل گیا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ اُس کے ہاتھ میں ایسے دو آدمی ہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر دو آدمی ہیں تو ایک کو میٹ کے پیچھے لگاؤ اور دوسرے کو جمیلاں کے میکے گاؤں کے قریب اُس راستے پر کہیں چھپ کر دیکھنے کے لئے بھیج دو جو راستہ قصبے سے گاؤں کو جاتا ہے۔ آپ کو یاد رہنا چاہئے کہ جمیلاں اور وہاب ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔

قارئین کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں کوئی جادوگر نہیں تھا۔ یہ پولیس

کی ایک چھٹی حس ہوتی ہے اور تجربہ روشنی دکھاتا ہے۔ پولیس آفیسر فرض کا دیانتدار ہو تو اندھیرے میں بھی اُسے راستہ مل جاتا ہے۔ کئی تیر ہوا میں ہی چلائے جاتے ہیں۔ اُن میں ایک بھی نشانے پہ جا لگے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ مجھے وہم ہو گیا تھا کہ چوکیدار وہاب کے گاؤں گیا ہے۔

اُس کی خبر آنے تک میں نے جمیلاں کے خاوند سے پوچھ گچھ کی۔ اُسے ایک بار پھر کہا کہ اُس کے گھر میں چوری کسی گھر کے بھیدی نے کرائی ہے یا گھر کے ہی کسی فرد نے کرائی ہے، اس لئے وہ گھر کی ذرا ذرا بات بتا دے اور اگر وہ کچھ بھی نہیں بتائے گا تو اُسے مال واپس نہیں مل سکے گا۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُس کی حفاظت کروں گا اور ہر طرح کی مدد کروں گا۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کیا کہوں"۔۔۔ اُس نے رونی سی صورت بنا کر کہا۔۔۔ "آپ مجھ سے پوچھیں، میں صحیح جواب دوں گا"۔

"تمہاری بیوی نے تم سے کبھی طلاق مانگی ہے؟"

اُس کے آنسو نکل آئے اور اُس کا سر جھک گیا۔ میری حوصلہ افزائی سے اُس کے منہ سے سسکی کی طرح یہ الفاظ نکلے۔۔۔ "اُس نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ کئی بار کہہ چکی ہے کہ مجھے طلاق دے دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے"۔

"اُس نے کب سے یہ کہنا شروع کیا تھا؟"

اُس نے جو جواب دیا، اس سے میں نے حساب کیا۔ وہاب جب سے جاگیر سے گاؤں آیا تھا، جمیلاں نے اپنے خاوند کے ساتھ یہ سلوک شروع کر دیا تھا۔

"تم جانتے ہو وہ کیوں طلاق مانگتی ہے؟"

"سب جانتا ہوں جی!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "اُس کے گاؤں کا ایک بڑا زمیندار ہے۔ یہ اُس کے چکّر میں آئی ہوئی ہے"۔

"تم کس طرح جانتے ہو؟"

"اچھی طرح جانتا ہوں جی!"۔۔۔ اُس نے اُداس اور دبے دبے

لہجے میں جواب دیا — "اس آدمی نے مجھے بھی کہا تھا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔"

"اُس نے تمہیں دھمکی دی تھی؟"

"کہتا ہے کہ مُنہ سے مانگو کتنی رقم مانگتے ہو" — اُس نے جواب دیا — "میں نے اُسے کہا کہ میں اپنی بیوی بیچوں گا نہیں۔ اُس نے دو تین بار مجھے کہا ہے کہ دس بیس ہزار لے لو اور رقم اپنے کاروبار میں ڈالو۔ اگر جمیلاں کا پلہ نہیں چھوڑو گے تو میں تمہیں بھکاری بنا دوں گا۔ اگر پولیس کی مدد لو گے تو قتل ہو جاؤ گے" — وہ بچوں کی طرح رونے لگا پھر بولا — "میں تنہا ہوں میں کوئی ایسا غریب تو نہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ میرے گھر سے چار ہزار روپیہ نکلا ہے۔ دکان میں مال بھی ہے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں اکیلا ہوں۔ اتنے بڑے زمیندار سے ٹکر نہیں لے سکتا۔"

"میں تو ٹکر لے سکتا ہوں" — میں نے کہا — "بس تمہاری بے عزتی کا انتقام لوں گا۔ کُھل کر بات کرو۔"

"کھل کر بات کروں" — وہ جیسے پھٹ پڑا ہو۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ جاندار آواز میں کہنے لگا — "وہاب میرے گھر آ کر میری بیوی کا خاوند بنا رہا ہے۔ مجھ پر ظلم یہ کیا گیا کہ جمیلاں نے مجھے بتایا کہ آج وہ آیا تھا اور سارا دن میرے پاس گزار گیا ہے۔ میں نے جمیلاں کے ماں باپ سے کہا۔ انہوں نے یہاں آ کر جمیلاں کو لعنت ملامت کی مگر اس کے بعد وہ بھی مُنہ موڑ گئے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا تو نہیں، میرا خیال ہے کہ وہاب نے انہیں ڈرا دھمکا لیا ہے یا روپے پیسے سے اُن کے مُنہ بند کر دیتے ہیں۔"

"اچھی طرح یاد کرو، سوچو، غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ جب تمہارے گھر میں چوری ہو چکی، چور ٹرنک پھینک گئے، اس کے بعد تمہاری بیوی کا رویہ کیا تھا؟ وہ روتی تھی؟ ڈری ہوتی تھی؟"

"سوچنا کیا ہے جی!" — اُس نے جواب دیا — "وہ نہ روتی تھی نہ

ڈری ہوتی تھی۔ مجھ پہ تو غشی طاری ہوتی جا رہی تھی اور وہ آرام سے بیٹھی تھی۔"

"اُس نے تمہیں کہا تھا کہ تھانے رپورٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں؟"

"یہ تو نہیں کہا تھا" — اُس نے جواب دیا — "اُس نے مجھے چوروں کے نکل جانے کے بعد شور مچانے سے منع کیا اور میرے مُنہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔"

"اپنے بیٹے کا تمہارے ساتھ سلوک کیسا ہے؟"

"وہ تو میرا باپ ہے" — اُس نے جواب دیا — "وہ دکاندار کا نہیں نواب رام پور کا بیٹا ہے۔"

"تم نے خود اُسے پیسے دے دے کر خراب کر رکھا ہے" — میں نے کہا۔ میں نے اُسے یہ اشارہ نہ دیا کہ شبیر اُس کا بیٹا نہیں۔

"میں نے اُسے کبھی اتنے پیسے نہیں دیئے جتنی وہ عیش و عشرت کرتا ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"ماں دیتی ہو گی۔"

"وہ بھی دیتی ہے" — اُس نے کہا — "اسے مُنہ مانگی رقم وہاب سے ملتی ہے۔ اب تو یہ شخص اپنے گاؤں میں آ گیا ہے۔ یہاں آتا ہے تو میرے بیٹے کو پیسے دے جاتا ہے۔ بیٹا گاؤں جا کر بھی پیسے لے آتا ہے۔ اب وہ اتنے دنوں سے گھر نہیں آیا۔ اس کی ماں نے مجھے کہا تھا کہ گھوم پھر کر آ جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ گاؤں گیا ہو گا۔ وہاں سے پتہ کرایا ہے۔ وہاں نہیں گیا۔"

اس سے کچھ اور باتیں پوچھ کر کہا کہ وہ بے غم رہے اور کسی سے ذکر نہ کرے کہ میں نے اس سے کیا پوچھا ہے۔ وہ جمیلاں کو صرف اس لئے طلاق نہیں دے رہا تھا کہ اس میں وہ اپنی بے عزتی سمجھتا تھا۔ وہ اپنے وقار کے لئے گھر میں اذیت برداشت کر رہا تھا۔ میں نے اسے بھیج دیا اور جو کچھ مجھے اُس وقت تک معلوم ہوا تھا اس پہ غور کرنے لگا۔ مجھ پہ

واضح ہونے لگا کہ یہ ہمارے معاشرے کے اُن ڈراموں میں سے ایک ہے جس میں دولت اور جاگیرداری اہم اور غالب کردار ادا کیا کرتی ہیں ۔ غالب سے میرا مطلب یہ ہے کہ دولت اور جاگیرداری عقل پر غالب آ جاتی ہیں اور جو کسر رہ جاتی ہے اسے جذبات پورا کر دیتے ہیں ۔

انگوٹھی والی انگلی نظر آگئی

میں نے ہوا میں جو تیر چلایا تھا وہ ضائع نہ گیا۔ مجھے آج تک وہ وقت یاد ہے کہ چوکیدار اپنے میٹ کے ساتھ تھانے میں آیا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس وقت میں اپنے گھر میں آرام کر رہا تھا۔ مجھے ہیڈ کانسٹیبل نے آکر دو خبریں سنائیں۔ ایک یہ کہ چوکیدار آگیا ہے اور دوسری یہ کہ جمیلاں اور وہاب کے گاؤں جس آدمی کو بھیجا تھا، وہ بھی آگیا ہے اور وہ باہر کھڑا ہے۔ میں نے اُسے اندر بلا کر پوچھا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ اُس نے بتایا کہ گاؤں سے ذرا دُور ایک درخت کے نیچے اس طرح بیٹھ گیا کہ سر پر چادر کا گھونگھٹ تھا اور ہاتھ میں روٹی تھی جیسے کوئی مسافر آرام اور کھانے کے لئے بیٹھ گیا ہو۔ کچھ دیر بعد قصبے کے کسی اور وارڈ کا ایک چوکیدار تیز تیز چلتا گاؤں کی طرف چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ میرا مطلوبہ چوکیدار تھا۔ ہمارا آدمی دوسرے چوکیدار کو بھی پہچانتا تھا۔ دونوں چوکیدار گپ شپ لگاتے مُخبر کے قریب سے گزر آتے۔ مخبر اُٹھا اور ایک اور راستے سے اُس وقت تھانے پہنچا جب مطلوبہ چوکیدار میٹ کے ساتھ تھانے میں ابھی پہنچا ہی تھا۔ دوسرا مخبر بھی آگیا تھا۔

میں اپنے دفتر میں جا بیٹھا اور میٹ کو بلایا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ چوکیدار کو کہاں سے لاتے ہو؟

"یہ اپنی بیوی کے گاؤں چلا گیا تھا" — اُس نے کہا — "میں خود اسے بلانے گیا تھا۔ ابھی اسے لے کر آ رہا ہوں۔"

آپ اس کا جھوٹ سمجھ گئے ہوں گے۔ میٹ نے دوسرے چوکیدار کو بھیجا تھا۔ خود نہیں گیا تھا اور یہ چوکیدار اپنی بیوی کے گاؤں نہیں وہاب اور جمیلاں کے گاؤں گیا تھا۔

چوکیداروں کا یہ میٹ جس کا نام غالباً ہاشم علی خان تھا میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمارے درمیان میز تھی۔ ہاشم نے اپنا ایک ہاتھ میز پر رکھا ہُوا تھا۔ میری نظر اتفاق سے اُس کے ہاتھ کی چھوٹی کے ساتھ والی اُنگلی پر گئی۔ اس انگلی پر ایک نشان تھا جسے ہر کوئی پہچان سکتا ہے۔

یہ انگوٹھی کا نشان تھا جیسے بڑے لمبے عرصے سے انگوٹھی ہر لمحہ اس انگلی میں رہی ہو۔ ہاشم کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ انگوٹھی کی جگہ انگلی کا رنگ کم سانولا تھا۔ ایک انگوٹھی میرے پاس تھی جو مجھے واردات کے گھر سے دیوار کے ساتھ کیچڑ میں پڑی ملی تھی۔

میں نے انگوٹھی نکال کر ہاشم کے آگے رکھ دی اور کہا — "اپنی انگوٹھی انگلی میں ڈال لو ہاشم! میرا خیال ہے یہ دیوار پھلانگتے ہوئے گر پڑی تھی۔"

اُس نے پہلے انگوٹھی کو دیکھا، پھر اپنی انگلی کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا اور احمقوں کی طرح مسکرا کر بولا — "آپ مذاق کر رہے ہیں حضور!"

"ہاشم!" — میں نے دھیمی سی آواز میں کہا — "یہ انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈال لو۔"

اُس نے کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈالی۔ میرے کہنے پر اُس نے ہاتھ میرے آگے کیا۔ انگوٹھی ذرا ڈھیلی تھی۔ اس کے گرنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں نے انگوٹھی اُتروا لی۔ اس کا میں نے باقاعدہ مشیر نامہ برآمدگی تیار کیا تھا۔ ہاشم سے میں نے اور کچھ بھی نہ پوچھا۔ چوکیدار کو اندر بلا لیا۔

"تمہیں یہاں کون لایا ہے اور کس گاؤں سے لایا ہے؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "جھوٹ بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ مجھے سچ کا پتہ چل چکا ہے۔"

ہاشم علی خان پر پہلے ہی سکتہ طاری تھا۔ ویسی ہی چُپ چوکیدار کو لگ گئی۔ مَیں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بُلایا اور اُسے کہا — "اُسے اندر لے آؤ"۔ — وہ چوکیدار اندر آیا جو مطلوبہ چوکیدار کو وہاب کے گاؤں سے لایا تھا۔ میں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ ہاشم اور مطلوبہ یعنی مشتبہ چوکیدار سے کہا کہ وہ اب میرے سوال کا جواب دیں۔ ہاشم نے دبی دبی زبان میں کہا — "آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔

"اب تم بھی ٹھیک ٹھیک بتا دو اور اپنی جان چھڑاؤ"۔ — میں نے کہا — "سُوٹ کیس کہاں ہے؟"

"وہاب کے گھر" — اُس نے جواب دیا۔

میں نے ہاشم کو الگ کر لیا۔ وہ چوروں میں شامل تھا۔ اُس نے اقبالِ جرم کر لیا، پھر چوکیدار نے بھی اقبالِ جرم کر لیا۔ میں نے دونوں سے وعدہ کیا تھا کہ وعدہ معاف گواہ بنا دوں گا۔ یہ وعدہ جھوٹا تھا۔ چور چار تھے۔ ایک ہاشم اور باقی تین وہاب کے نوکر چاکر تھے۔ گھر بھیدی جمیلاں تھی۔ چوروں نے جب تعاقب سے گھبرا کر ٹرنک پھینکے تو ہاشم نے کہا تھا کہ سُوٹ کیس نہ پھینکنا۔ صرف اُسے معلوم تھا کہ اس میں زیورات اور نقدی ہے۔ چوکیدار اُن کی رکھوالی کر رہا تھا۔ اُس نے تعاقب کرنے والوں کو غلط سمت بتا کر کہا تھا کہ چور اُدھر گئے ہیں۔

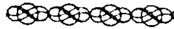
میں نے اُسی وقت (نصف شب سے ذرا بعد) پولیس پارٹی کے ساتھ وہاب کے گاؤں پہنچ کر اُس کے گھر چھاپہ مارا۔ وہاب کی حالت وہی ہوتی جو ملک کے اُس صدر کی اُس وقت ہوتی ہے جسے فوجی آدھی رات کو جگاتے اور کہتے ہیں کہ جناب زیرِ حراست ہیں اور جناب کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہے۔ مجھے اپنے اوپر قابو ہوتا تھا مگر وہاب کو دیکھ کر میں بے قابو ہو گیا۔ ان دولت مندوں اور جاگیرداروں نے انسانوں کو اپنا غلام سمجھ رکھا ہے۔ اُس نے پہلے مجھے دھمکی دی پھر مُنہ مانگی رشوت پیش کی اور یہ بھی کہا کہ گاؤں کی جس لڑکی پر ہاتھ رکھو اُسے لے جاؤ۔

مَیں نے اُس کے مُنہ پر اس قدر زور سے تھپڑ مارا کہ تین چار دن میرا ہاتھ درد کرتا رہا اور میں نے اُسے وہ ننگی گالی دی جو میں ایسی ہی تقریب پر دیا کرتا تھا۔ اس ظالم نے ایک شریف اور سیدھے سادے سے دکاندار کی بیوی پر قبضہ کرنے کے لئے اُس کے لئے اذیت پیدا کی تھی۔

اُس کے گھر چوری کرائی پھر اُسے قتل کی دھمکی دی۔ وہاب کو زیورات اور رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ جمیلاں اُس کے پاس آجائے گی اور اپنا زیور لے لے گی۔

میں نے سُوٹ کیس برآمد کر لیا۔ اُس نے اقبالِ جرم نہ کیا۔ جمیلاں کو بھی گرفتار کیا۔ اُس نے بھی اقبالِ جرم نہ کیا۔ میں نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا۔ سرکاری وکیل نے بہت مدد کی۔ وہاب کو چار سال، جمیلاں کو دو سال اور چوروں کو چار چار سال سزائے قید دی گئی۔

میں نے مقدمے کی سماعت کے دوران شبیر کو دیکھا بہت خوبصورت لڑکا تھا۔ اُسے وہاب نے واردات والے دن اپنی جاگیر پر بھیج دیا تھا — میں نے مجرموں کو کیفرِ کردار تک تو پہنچا دیا لیکن وہاب اور جمیلاں نے جس طرح محبت نبھائی، میں اس کی تعریف کرتا ہوں۔ میں نے مقدمے کے دوران سرکاری وکیل سے کہا تھا کہ محبت ضرور ہونی چاہئے مگر ایسی نہیں!



سُندری کا سودا

شادی شُدہ عورت لاپتہ ہوگئی۔ عمر بائیس تیئس سال بتائی گئی۔ حُلیہ جو بتایا گیا، اس سے پتہ چلا کہ خاصی خوبصورت تھی۔ نام سُندری بتایا گیا۔ ہندو تھی۔ اس کا گاؤں تھانے سے تقریباً اڑھائی میل دُور تھا۔ رپورٹ لکھوانے اُس کا خاوند اور سُسر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ اُس کی گود میں چھ ماہ کا بچّہ ہے جسے وہ ساتھ لے گئی ہے۔

"کچھ اور بھی لے گئی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"اپنے تمام زیورات اور دو ہزار روپیہ نقد" — سُندری کے سُسر نے کہا — "یہ رقم ایک ٹرنک میں تھی۔"

وہ کہہ رہے تھے کہ اغوا ہُوئی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اغوا ہُوئی ہوتی تو بچّہ، زیورات اور رقم ساتھ نہ لے جاتی۔ یہ چوری کا کیس ہو سکتا ہے، اغوا کا نہیں۔ سُندری کا خاوند بھی میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس کی مردانگی کو چوٹ پڑی تو وہ بھڑک کر بولا — "میں نہیں مان سکتا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اُسے زبردستی اغوا کیا گیا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تمہارے گھر میں ڈاکہ پڑا ہے" — میں نے کہا — "اور ڈاکو تمہاری بیوی اور تمہارے بچّے کو اُٹھا لے گئے ہیں، اور سارے زیورات اور دو ہزار روپیہ بھی ٹرنکوں میں سے نکال لے گئے ہیں.... تم لوگ جو رپورٹ لکھوانا چاہتے ہو میں لکھ لوں گا لیکن رپورٹ غلط ہوئی تو تمہارے خلاف کارروائی ہوگی .... یہ بتاؤ کہ تمہیں کس وقت پتہ چلا کہ لڑکی لاپتہ ہے؟"

اُنہوں نے بتایا کہ اُسے غائب ہُوتے دو دن گزر گئے ہیں۔ وہ دو دن خود ہی تلاش کرتے رہے۔ سُندری کا خاوند اُس رات کسی دوسرے گاؤں گیا ہُوا تھا۔ سُندری برآمدے میں سوئی ہوئی تھی۔ اُس کا سُسر، ساس اور ان کے دو چھوٹے بیٹے صحن میں سوتے ہُوتے تھے۔ صبح دیکھا کہ سُندری بستر میں نہیں تھی، بچّہ بھی نہیں تھا۔ گاؤں سے کوئی پون میل دُور ایک ندی تھی۔ سُندری سہیلیوں کے ساتھ صبح مُنہ اندھیرے ندی پر نہانے جایا کرتی تھی لیکن بچے کو کبھی ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ پھر بھی ان لوگوں نے ندی پر جاکر دیکھا۔ اُس کے ساتھ جو لڑکیاں جایا کرتی تھیں، اُن سے پوچھا۔ سب نے بتایا کہ سُندری اُن کے ساتھ نہیں گئی تھی۔

گھر آکر ٹرنک دیکھے تو پتہ چلا کہ سُندری کا سارا زیور اور دو ہزار روپیہ نقد بھی اُس کے ساتھ چلا گیا ہے۔ اُنہوں نے اُس کے گاؤں جاکر اُس کے والدین سے پوچھا کہ اِدھر تو نہیں آئی؟ انہوں نے کہا کہ وہ چوری چھپے تو کبھی نہیں آئی۔

"وہ لوگ کیسے ہیں؟"— میں نے پوچھا۔

"بہت اچھے بھی نہیں اور بُرے بھی نہیں"— سُندری کے سُسر نے جواب دیا۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہُوں کہ تمہیں ان پر ایسا شک ہے کہ لڑکی زیور اور رقم چوری کر کے اپنے گھر لے گئی ہو اور وہ مال ہضم کر گئے ہوں؟"

"میں ایسا شک نہیں کروں گا"— سُسر نے جواب دیا— "لیکن زیور اور پیسہ انسان کا دھرم برباد کر دیتا ہے۔"

"لڑکی پہلے بھی کبھی بتائے بغیر اپنے گھر گئی تھی؟"

"ایسا کرتی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دیتا"— سُندری کے خاوند نے کہا۔

"تم لوگ کیا کام کرتے ہو؟"

"ہمارا زمینداره ہے"— سُسر نے جواب دیا— "زمینیں میرے

اس لڑکے کے سپرد ہیں اور میں ساہوکارہ بھی کرتا ہوں۔"

"کسی ایسے آدمی کو تم نے قرض دے رکھا ہے جو تمہیں تنگ کرتا ہو؟"— میں نے پوچھا— "یا جسے تم تنگ کرتے ہو؟"

"میں حساب کتاب صاف رکھتا ہوں"— اُس نے جواب دیا— "نہ میں کسی کو تنگ کرتا ہوں نہ کوئی مجھے پریشان کرتا ہے۔"

میں نے یہ سوال کچھ سوچ کر پوچھا تھا۔ سُود پر قرض دینے والے ساہوکار اَن پڑھ دیہاتیوں کی زمینیں گِروی رکھ لیا کرتے تھے، پھر حساب کتاب میں ایسی ہیرا پھیری کرتے تھے کہ قرض لینے والا سُود ہی دے دے کر کنگال ہو جاتا اور اصل زر جُوں کا تُوں باقی رہتا تھا۔ کچھ عرصے بعد ساہوکار گِروی رکھی ہوئی زمین کا مالک بن جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس ساہوکار نے کسی دیہاتی کی زمین قرض کے سلسلے میں دبالی ہو گی اور اُس نے انتقاماً اس کی بہو کو بچّے سمیت اغوا کر لیا اور ٹرنکوں سے زیورات اور نقدی بھی لے گیا۔ یہ کام اکیلے آدمی کا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ تین چار آدمی ہوں گے، لیکن یہ مجھے ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ ایسا کمال تو اُستاد ڈاکو بھی نہیں دکھا سکتے۔

مجھے ہر امکان پر غور کرنا تھا۔ بہو بیٹی کے اغوا یا گمشدگی کی واردات میں لوگ پولیس کے لئے یہ دشواری پیدا کر دیا کرتے ہیں کہ دو تین دن خود تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انہیں امید ہوتی ہے کہ لڑکی درپردہ مل جائے گی اور سارے خاندان کی رسوائی نہیں ہو گی۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر پولیس کے پاس آتے ہیں۔ اس عرصے میں لڑکی کا کھُرا کھوج مِٹ چکا ہوتا ہے اور لڑکی بہت دُور نکل جاتی ہے یا مکمل طور پر چھُپا لی جاتی ہے۔ میرے لئے یہی دشواری ان لوگوں نے پیدا کر دی تھی۔ مجھے یہی نظر آرہا تھا کہ لڑکی اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی گئی ہے۔

اپنی مرضی سے چلے جانے کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ خاوند سے مطمئن نہیں ہوتی۔ میں نے بھاگ جانے والی بیویوں کو اور اُن کے خاوندوں کو دیکھا ہے۔ ایسی بیویاں خوبصورت اور خاوند بھدّے اور بدصورت،

مریل اور دائمی مریض یا بوڑھے ہوتے ہیں لیکن اس واردات میں مجھے یہ وجہ نظر نہیں آرہی تھی۔ سُندری کا خاوند گٹھا ہُوا جوان تھا۔ شکل وصورت اچھی تھی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی عورت اس آدمی سے مطمئن نہ ہو۔ میں نے اس کے باپ کو دفتر سے نکال کر اس خاوند سے بات کی۔

"تمہیں کس پر شک ہے؟"

"مجھے کسی پر شک ہوتا تو وہ زندہ نہ ہوتا"۔۔۔اُس نے جواب دیا۔۔۔"کیا آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اُس کا دل کسی اور کے ساتھ تھا اور وہ اُس کے ساتھ چلی گئی ہے؟"

"میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے کبھی کوئی ایسی بات سُنی تھی کہ تمہاری بیوی شادی سے پہلے یا بعد کسی سے ملتی ملاتی تھی یا اس کے چال چلن کے متعلق کوئی بات مشہور ہوئی ہو؟"۔۔اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ چُپ رہا۔ میں نے اپنا سوال واضح کرنے کے لئے کہا۔۔۔"بعض جھوٹے بہتان مشہور ہو جاتے ہیں۔ یہ دشمنوں کا کام ہوتا ہے۔ جھوٹے بہتان ایسے آدمی بھی لگاتے ہیں جن کی بُری نظر لڑکی پر ہوتی ہے لیکن لڑکی انہیں دھتکار دیتی ہے۔ اُسے بدنام کرنے کے لئے اُس کے چال چلن کے خلاف جھوٹی باتیں مشہور کر دی جاتی ہیں۔"

"کوئی ایسی جرأت نہیں کر سکتا کہ میری بیوی کے خلاف اُونچی سانس بھی لے"۔۔۔اُس نے بڑے رعب سے کہا۔

"غور سے سُنو میرے راجپوت دوست!"۔۔۔میں نے کہا۔۔۔"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہاری بیوی اپنی مرضی سے گئی ہے۔ وہ تمہیں پسند نہیں کرتی تھی۔"

"عورت کی کیا مجال کہ اپنے خاوند کو پسند نہ کرے"۔۔۔اُس نے راجپوتوں کے رعب بلکہ عتاب سے کہا۔۔۔"بیوی پاؤں کی جُوتی کے برابر ہوتی ہے۔ آپ اپنا کام کریں۔ اُسے تلاش کریں۔ میں اپنا کام کر دوں گا۔ اُسے ڈھونڈوں گا۔ مل گئی تو اُس کی لاش آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔"

اُس کے ساتھ بہت باتیں ہُوئیں مگر وہ مجھے کوئی سراغ دینے کی بجائے یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ بڑا جابر آدمی ہے اور سُندری اُس کی پُجارن تھی اور وہ اُسے جہاں ملی وہیں قتل کر دے گا۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لڑکی کے بھاگنے کا باعث کیا ہے۔ وہ ساس اور سُسر کے ہاتھوں تنگ ہو گی لیکن اُس کے خاوند نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے ایک اور خیال آگیا۔ ان کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے لیکن بچّہ اب پیدا ہُوا تھا۔ نارمل جسمانی حالت میں بچّہ دوسرے سال پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے اُس سے بچّہ اتنی دیر سے پیدا ہونے کی وجہ پوچھی تو اُس نے دبی دبی آواز میں کہا۔۔۔"یہ پرماتما سے پوچھیں۔"

وہ دُور نکل گئی تھی

میں کاغذی کارروائی مکمل کر کے باپ بیٹے کے ساتھ اُن کے گھر چلا گیا۔ وہ جگہ دیکھی جہاں سُندری رات کو سوتی تھی۔ اُس رات چونکہ اُس کا خاوند گاؤں سے باہر گیا ہُوا تھا اس لئے وہ صحن میں سوتی تھی۔ گھر کے دوسرے افراد برآمدے میں سوتے تھے۔ ٹرنک وغیرہ جس کمرے میں تھے، اس کے سامنے بھی برآمدہ تھا جو خالی تھا۔ گھر والے اس کے سامنے والے برآمدے میں تھے۔ لہٰذہ لڑکی کے لئے رات کو اُٹھ کر ٹرنکوں میں سے زیورات اور رقم نکال کر اور بچّے کو اُٹھا کر باہر نکل جانا مشکل نہیں تھا۔ صحن کی دیوار اُونچی تھی لیکن پیشہ ور مجرموں کے لئے اس دیوار کو پھاندنا مشکل نہیں تھا۔ یہ ممکن تھا کہ باہر سے ڈاکو آئے۔ لڑکی کو کچھ سُنگھا کر یا اس کے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر اٹھا لیا اور کسی گھر بھیدی کی راہنمائی میں انہوں نے وہی دو ٹرنک کھولے جن میں سے ایک میں زیورات اور دوسرے میں نقدی تھی۔ وہ بچّے کو بھی لے گئے۔ یہ انتقامی کارروائی ہو سکتی تھی۔ انتقام کی وجوہات کئی ایک ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔

سُندری کے سُسر نے کسی کو سُودی قرض دے کر اُس کے ساتھ دھوکہ کیا ہوگا۔ دوسری وجہ یہ کہ سُندری کے خاوند نے کسی کی بہو بیٹی کو اپنی جوانمردی اور گاؤں میں اپنی اُونچی حیثیت کے نشے میں بے آبرو کیا ہو گا۔ سُندری نے کسی نامی گرامی غُنڈے بدمعاش کا دل توڑا ہوگا۔ ان کے علاوہ کچھ اور وجوہات بھی ہوسکتی تھیں۔ مجھے سُندری کے سُسر کا بہی کھاتہ بھی دیکھنا تھا کہ اُس نے کِس کِس کو قرض دے رکھا ہے۔ پھر یہ دیکھنا تھا کہ ان میں سے کون سا آدمی اتنا بڑا جُرم کرنے کی اہلیّت رکھتا ہے۔

میں نے مکان کو اندر باہر سے اچھی طرح دیکھ لیا لیکن اب کوئی سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ لڑکی کی گمشدگی کا تیسرا دن تھا۔ میں نے اُس کی ساس کو الگ بٹھا لیا۔ عورت کے دل کی بات کو عورت ہی جان سکتی ہے۔ کئی راز جو مردوں سے چھپے رہتے ہیں، عورتوں کو معلوم ہوجاتے ہیں۔ میں نے اُس کی ساس کے دل پر قبضہ کرنے کے لئے کہا کہ تمہاری بہو بڑی بدمعاش نکلی، تمہیں اتنا بڑا دھوکہ دے گئی ہے۔ مجھے توقع تھی کہ ساس اپنی بہو کے خلاف بات سُن کر خوش ہوگی۔ یہ تو ہمارے ہاں کا رواج ہے۔

"نہ جی!" — ساس نے یہ کہہ کر مجھے پریشان کر دیا — "وہ تو بڑی بھاگوان تھی" — اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"اُس کے چال چلن کے خلاف کبھی کوئی بات تمہارے کانوں تک پہنچی تھی؟"

"وہ تو باہر ہی نہیں نکلتی تھی" — اُس نے جواب دیا — "کبھی کوئی بات نہیں سُنی تھی۔ ہر کوئی اُس کی تعریف کرتا تھا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ میری سگی بیٹی مر گئی ہے۔"

"میاں بیوی آپس میں خوش تھے؟"

"خوش ہی نظر آتے تھے" — اُس نے کہا — "میرا بیٹا ذرا اکھڑ طبیعت کا ہے۔ اپنے رعب میں رہتا ہے۔ سُندری پہ ہاتھ بھی اُٹھا دیتا تھا اور میں اسے روکتی تھی کہ ایسی بھاگوان لڑکی پہ ہاتھ نہ اٹھایا کرو۔"

"عام طور پہ تمہارا بیٹا اُسے کیوں مارتا پیٹتا تھا؟"

"یہ تو کبھی مجھے بھی پتہ نہیں چلا" — اُس نے جواب دیا — "میں سُندری سے بھی کہا کرتی تھی کہ میرا بیٹا جانور ہے، اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کیا کرو۔"

یہ میرے لئے بڑا اچھا اشارہ تھا۔ مار پٹائی کی کوئی ایسی وجہ ہو گی جس سے سُندری کی ساس کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ لڑکی کا چال چلن صرف اس لئے قابلِ تعریف نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔ خراب چال چلن والی لڑکیاں باہر تو نہیں گھومتی پھرتی رہتیں۔ مجھے سُندری کے سُسر نے بتایا تھا کہ وہ لڑکیوں کے ساتھ صبح سویرے ندی پہ نہانے جاتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر بھی جاتی ہوگی۔ وہ اگر کسی کے ساتھ گئی ہے تو وہ آدمی اُس کے اپنے گاؤں کا یا سُسرال کے گاؤں کا ہوسکتا تھا۔ اب ناکہ بندی بیکار تھی۔ وہ میرے خیال کے مطابق دُور نکل گئی تھی۔

اُس کے دل میں اگر اپنے خاوند کی نفرت تھی تو اس کی مجھے ایک وجہ یہ نظر آئی تھی کہ اُس کا خاوند اُسے مارتا پیٹتا تھا۔ میں دوسری وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ سُندری کا پہلا بچّہ شادی کے پانچویں سال کے آغاز میں ہُوا ہے۔ میں نے ساس کے ساتھ اس سلسلے میں ایسے انداز سے باتیں کیں جیسے میرا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ اجڈ دیہاتن یہ بتانے سے قاصر تھی کہ بچّہ اتنی دیر سے کیوں پیدا ہُوا۔ اس سلسلے میں باتیں کرتے مجھے محسوس ہُوا کہ میں بیوقوف آدمی ہوں جو ایک بیکار موضوع پہ ایک جاہل عورت کے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔ میں نے یہ موضوع بدل دیا۔

اس سے مجھے اور کچھ تو حاصل نہ ہُوا، البتّہ ایک نئی بات معلوم ہُوئی۔ سُندری جس ندی پہ نہانے جایا کرتی تھی، اس کے پار ایک بہت پُرانا مندر تھا جو کھنڈر تو نہیں بنا تھا لیکن یہ عبادت کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ سُندری کی ساس نے بتایا کہ دہاں کچھ عرصے سے ایک

تارک الدنیا پنڈت آیا ہوا ہے جس کے ساتھ تین چار پنڈت اور سادھو بھی ہیں۔ یہ پنڈت ہر مرض کی دوا کے لئے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے پیروں کی طرح مُرادیں بھی سُنتا اور بے اولاد عورتوں کو اولاد بھی دیتا تھا۔ ساس نے سُندری سے کہا تھا کہ وہ اس مندر میں جایا کرے اور پنڈت سے کہے کہ اولاد دے۔ سُندری ڈیڑھ سال سے وہاں جا رہی تھی۔ اُس کی ساس کے کہنے کے مطابق سُندری صبح سویرے ندی پہ جاتی تھی تو تیسری چوتھی صبح مندر میں بھی جاتی تھی۔

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اُسے بچّہ پنڈت کی دعا سے مِلا ہے؟"

"میں تو یہی سمجھتی ہوں" ــــ ساس نے جواب دیا۔

"کیا تمہارے بیٹے کو معلوم تھا کہ سُندری پُرانے مندر میں اولاد کے لئے جاتی ہے؟"

"معلوم ہوگا" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "مندر میں جانا پاپ تو نہیں"

میں پنڈتوں کی کرتوت سے اچھی طرح واقف تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مندروں کے اندھیرے کمروں میں کیا ہوتا ہے۔ یہ مندر ہمارے پیروں کے حجروں سے ملتے جُلتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پنڈت، سادھو اور پیر کی دعاؤں سے بے اولاد عورتوں کے ہاں جو بچّے پیدا ہوتے ہیں، ان کے باپ کون ہوتے ہیں۔ یہ پنڈت اور پیر اولاد پیدا نہ کر سکنے والے خاوندوں کی مردانگی کی لاج رکھ لیتے ہیں۔ اس معاملے میں پیر اور پنڈت ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کسی بے اولاد خاوند کے ہاں بچّہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ یہ بچہ اُسی کا ہے۔

میں نے اپنے ذہن میں نوٹ کر لیا کہ سُندری کی گمشدگی کے ساتھ پرانے مندر کے تارک الدّنیا پنڈت کا تعلق ہو سکتا ہے۔

پیار کی پیاسی تھی

گاؤں کا نمبردار، ذیلدار اور سفید پوش میرے ساتھ تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ اُن لڑکیوں کو بلا لائیں جو سُندری کے ساتھ ندی پہ نہانے جایا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تین لڑکیاں لائی گئیں۔ میں نے ہر ایک لڑکی سے الگ الگ پوچھ گچھ کی۔ ان سے ان سوالوں کے جواب لئے کہ سُندری اپنے خاوند کے ساتھ خوش تھی یا نہیں۔ کیا وہ ندی پر کسی سے ملتی تھی؟ کیا پنڈت اُس پہ زیادہ مہربان تھا؟ وہ کسی اور کو چاہتی تھی؟

دیہات کی نوعمر لڑکیوں کے مُنہ سے راز کی بات نکلوانا آسان نہیں ہوتا۔ وہ پولیس سے ڈرتی بھی ہیں اور ان میں جھجک بھی ہوتی ہے۔

میں نے اپنے انداز سے ہر لڑکی کے دل سے پولیس کا خوف نکالا اور انہیں کھُل کر بات کرنے کے لئے تیار کیا۔ مجھے ان سے یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ وہ بھی سُندری کے ساتھ مندر میں جایا کرتی اور پوجا پاٹھ کرتی تھیں۔ سُندری بڑے پنڈت کے پاؤں میں ماتھا رگڑتی اور اُس سے اولاد مانگتی تھی۔ کچھ دن بعد پنڈت نے یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ وہ سُندری کو الگ کمرے میں لے جاتا تھا اور کچھ دیر بعد سُندری اکیلی باہر آتی تھی ــــ اس کے بعد اُس نے ایک بچّے کو جنم دیا۔

یہ بات مجھے ہر ایک لڑکی نے بتائی اور میں نے ہر ایک لڑکی سے پوچھا کہ وہ جب پنڈت کے ساتھ کسی اور کمرے میں جا کر واپس آتی تھی تو اُس کی حالت کیسی ہوتی تھی۔ کوئی لڑکی بھی میرے اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ میری کوشش سے انہوں نے یہ بتایا کہ کبھی بہت خوش ہوتی اور کبھی اُداس ہوتی تھی۔ ان لڑکیوں سے مجھے پتہ چلا کہ شادی سے پہلے سُندری بہت شوخ اور چلبلی ہوا کرتی تھی۔ لڑکیوں کو سُندری کے متعلق یہ بات اُس کے میکے گاؤں سے معلوم ہوئی تھی۔ شادی کے ابتدائی ایک دو مہینے وہ سُسرال میں بھی شوخ اور چلبلی رہی۔ اس کے بعد وہ چپ چاپ

رہنے لگی۔

میرے پوچھنے پر لڑکیوں نے بتایا کہ مندر میں دوسرے گاؤں کی بھی عورتیں آتی ہیں اور مرد بھی وہاں جاتے ہیں لیکن ان مردوں اور عورتوں کی تعداد اتنی نہیں ہوتی جتنی گاؤں کے مندر میں جاتی ہے۔

لڑکیوں سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ گاؤں کے مندر کا پنڈت گاؤں والوں کو پرانے مندر میں جانے سے روکتا ہے۔

ان میں سے کسی بھی لڑکی کو معلوم نہیں تھا کہ سُندری کسی اور کو چاہتی ہے یا نہیں۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ اپنے خاوند سے وہ نالاں تھی۔ وہ سہیلیوں کے سامنے اپنا رونا روتی تھی۔ انہیں بتایا کرتی تھی کہ اُس کا خاوند حیوان ہے۔ اُس کے دل میں پیار نہیں۔ اُس کے ساتھ وہ صرف جسمانی تعلق رکھتا ہے مگر بچہ نہیں ہوتا۔ ذرا ذرا سی بات پر اُسے ڈانٹتا اور پٹائی بھی کر دیتا ہے۔ سُندری بچے کی نہیں پیار کی طلبگار تھی۔ اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ پیار کیسا ہوتا ہے جس کی لوگ کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔ وہ جب کسی شادی شدہ عورت کی زبان سے سنا کرتی کہ اُس کا خاوند اُس کے ساتھ دلی محبت کرتا ہے تو وہ اُداس ہو جایا کرتی تھی۔

مختصر یہ کہ ان لڑکیوں سے مجھے پتہ چلا کہ سُندری پیار کی پیاسی تھی مگر اُس کا خاوند حیوان نہیں بلکہ وحشی تھا۔ سُندری اس سے نہ روحانی طور پر مطمئن تھی نہ جسمانی طور پر۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کون تھا جس سے اُسے اطمینان حاصل ہو گیا اور وہ خاوند کو چھوڑ کر اُس کے ساتھ چلی گئی۔ لڑکیوں کو میں نے بہت کریدا۔ انہیں یقین تھا کہ اس گاؤں میں کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جس کے ساتھ سُندری کی درپردہ راہ و رسم ہوتی۔ میں نے گاؤں کے نمبردار وغیرہ سے معلوم کر لیا تھا کہ گاؤں سے کوئی آدمی غیر حاضر نہیں اور اتنے بڑے زمیندار اور ساہوکار کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کسی میں جرأت بھی نہیں۔

ان لڑکیوں میں ایک خاصی ذہین اور ہوشیار تھی۔ اس کی شادی

ہوتے دو سال گزر گئے تھے۔ پختہ باتیں کرتی تھی۔ اس نے مجھے زیادہ باتیں بتاتی تھیں اور صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ ذہن پر زور دے کر سوچے اور مجھے بتائے کہ اُسے کبھی شک ہوا ہے کہ سُندری مندر میں جب پنڈت کے کمرے میں جاتی تھی تو وہاں پنڈت کے علاوہ کوئی اور آدمی بھی ہوتا تھا؟

"دو مرتبہ مجھے ایسا شک ہوا ہے" — اُس نے جواب دیا — "ہم مندر سے باہر آ گئی تھیں۔ سُندری کو پنڈت لے گیا تھا۔ وہ باہر آئی تو میں نے دوسری طرف سے ایک آدمی کو مندر سے نکلتے دیکھا۔ اُس طرف سے نہ کوئی اندر جاتا نہ باہر آتا تھا"

"وہ آدمی کس طرف چلا جاتا تھا؟" — میں نے پوچھا — "تمہارے گاؤں کی طرف آتا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اس کا منہ سر کپڑے میں لپٹا ہوتا تھا اور درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک گھوڑا کھڑا ہوتا تھا۔ وہ اس گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں غائب ہو جاتا تھا"

"ذہن پر ذرا اور زور دو" — میں نے کہا — "وہ جب گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا تھا تو کیا سُندری اُسے جاتے ہوئے دیکھا کرتی تھی؟"

لڑکی کے ماتھے پر شکن پیدا ہوئے اور اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

وہ ذہن پر زور دے رہی تھی۔ میں نے اُس کے چہرے پر تبدیلی دیکھی۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم آیا اور غائب ہو گیا۔

"جی ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اب یاد آتا ہے کہ میں نے دونوں مرتبہ دیکھا، سُندری نے رُک کر اور گھوم کر اُسے دیکھا تھا"

یہ تھا میرا مجرم، لیکن وہ کون تھا؟ — یہ تھا میرا مسئلہ۔

اس دوران مجھے چوکیدار نے آ کر بتایا کہ بڑا پنڈت پرانے مندر میں موجود ہے۔ میں نے جب لڑکیوں سے معلوم کر لیا تھا کہ سُندری بڑے

پنڈت کے ساتھ الگ کمرے میں چلی جایا کرتی تھی، اُس وقت میں نے چوکیدار کو بلا کر کہا تھا کہ وہ دیکھ آئے کہ بڑا پنڈت مندر میں موجود ہے یا نہیں۔ مجھے شک ہو گیا تھا کہ لڑکی کو پنڈت لے گیا ہے اور بچے کو اس لئے ساتھ لے جایا گیا ہے کہ بچہ سُندری کے خاوند کا نہیں پنڈت کا تھا۔ پنڈت کو مندر سے غائب ہو جانا چاہیئے تھا گر وہ وہاں موجود تھا۔

عورتیں زیادہ جاتی ہیں

مجھے اس پنڈت کو شاملِ تفتیش کرنا تھا مگر وہ پنڈت تھا اور میں مسلمان۔ اگر میں پرانے مندر پر چھاپہ مارتا تو ہندو اسے اپنے مندر اور مذہب کی توہین سمجھتے۔ یہ ہمارے لئے ایک مجبوری ہوتی تھی لیکن میں اپنی تفتیش کو نامکمل نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میرے اُوپر انگریز ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی تھے۔ روزمرہ کارگزاری ان کو بھیجی جاتی تھی۔ یہ مشکل تھانیداروں کے لئے سہولت بھی تھی۔ انگریز افسر ہمارا تحفظ اور ہر طرح تعاون کرتے تھے۔

مندر پر چھاپہ مارنے کے سلسلے میں مجھے انگریز افسروں کے تحفظ کی ضرورت تھی لیکن میرے لئے ایک اور راستہ صاف ہو چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ گاؤں کا پنڈت لوگوں کو پرانے مندر میں جانے سے روکتا ہے۔ یہ پنڈت میرے کام آسکتا تھا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ مسجدوں کے امام بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ یہ کاروباری رقابت ہوتی ہے۔ ایک محلے کی دو مسجدوں کے امام اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ زیادہ تر نمازی اُسی کی مسجد میں آئیں۔ ان کی اس عادت کی بدولت انہیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی حالت پنڈتوں کی ہوتی ہے۔

میں گاؤں کے پنڈت کے پاس چلا گیا۔ اُسے کہا کہ گاؤں کی جو

لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے وہ پرانے مندر میں جایا کرتی تھی اور مجھے شک ہے کہ اس مندر سے لڑکی کا سراغ مل جائے گا۔

پنڈت کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کہے گا۔ اُس نے چہک کر کہا — "پکڑ لو ملیچھ کو۔ میں اسی لئے لوگوں کو اس مندر میں جانے سے روکتا رہتا ہوں۔"

"مگر یہ مندر اور ایک پنڈت کا معاملہ ہے" — میں نے کہا — "اور میں مسلمان ہوں۔ اگر میں نے مندر پر چھاپہ مارا تو یہاں کے ہندو میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک مجرم مذہب کے پردے میں بے دھڑک جرم کرتا رہے گا۔"

"میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں" — پنڈت نے مجھے تسلی دی — "وہ پرانا مندر عبادت کے لئے نہیں۔ وہاں جو پنڈت آن بیٹھا ہے وہ مجھے کوئی نوسرباز نظر آتا ہے۔ وہ پنڈت ہے ہی نہیں۔ کوئی سنیاسی ہے۔ دوائیاں دیتے دیتے اُس نے اپنے چیلوں کے ذریعے مشہور کر دیا ہے کہ وہ مرادیں پوری کرتا اور اولاد دیتا ہے۔ لوگ چونکہ ان باتوں کو سچ مانتے ہیں اس لئے اُس کے پاس جانے لگے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ اُس نے وہاں مورتیاں وغیرہ رکھ کر مندر کو عبادت گاہ بنا دیا ہے مگر لوگ وہاں عبادت کے لئے نہیں بلکہ مُرادیں پوری کرانے اور دوائیاں لینے جاتے ہیں۔ عورتیں زیادہ جاتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں کیا ہوتا ہے ..... آپ نڈر ہو کر وہاں جائیں اور اس پنڈت اور اس کے چیلوں کو پکڑیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس پنڈت کا اپنا کردار کیا ہے۔ میں نے اسے خوب ہوا دی۔ اس کے جواب میں اس نے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں نے اُسے کہا کہ اِدھر اُدھر کے ہندو میرے خلاف گڑبڑ کریں تو وہ انہیں سنبھال لے۔

میں صرف اسی کا محتاج نہیں تھا۔ میں نے پرانے مندر کے اردگرد دیہاتی کپڑوں میں دو کانسٹیبل پنڈت پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کر دیئے اور تھانے میں جا کر ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ ٹیلیفون پہ بات کی۔ اُسے بتایا کہ میں ایک ایسے مندر پر چھاپہ مارنے جا رہا ہوں جہاں عبادت نہیں ہوتی اور وہاں سنیاسی قسم کا کوئی پنڈت ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے اُسے اختصار سے بتایا کہ واردات کیا ہے اور اس وقت تک کی تفتیش میں مجھے کیا کچھ معلوم ہوا ہے۔ اُس نے مجھے کچھ ہدایات دیں اور میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

نمبردار، ذیلدار اور سفید پوش کے علاوہ گاؤں کے دو ہندو معزز آدمی میرے ساتھ تھانے میں تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں آج رات پرانے مندر میں جا رہا ہوں اور وہ سب میرے ساتھ ہوں گے۔ انہوں نے پنڈت کی طرح میری حوصلہ افزائی نہ کی لیکن بُرا بھی نہ منایا۔ ان کی بھی بہو، بیٹیاں پرانے مندر کے پنڈت کے پاس جایا کرتی تھیں۔ میں دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ مندر سے مجھے کچھ سراغ مل جائے ورنہ ہندوؤں کے سامنے اپنی بے عزّتی کا اندیشہ تھا۔

یہاں کوئی جوان لڑکی نہیں آتی

میں دن بھر کا تھکا ہُوا تھا۔ رات گہری ہو گئی تھی لیکن پرانے مندر میں اسی وقت جانا ضروری تھا۔ گاؤں میں اس کے معتقد موجود تھے۔ میں نے جن تین لڑکیوں سے پوچھ گچھ کی تھی وہ یا ان کے والدین پرانے مندر کے پنڈت کو بتا سکتے تھے کہ میں اس کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا ہوں۔ خطرہ تھا کہ پنڈت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں نے مندر پر نظر رکھنے کے لئے دو بغیر وردی کانسٹیبل بھیج رکھے تھے۔

میں اندھیرے میں ندی کے کنارے پہنچا۔ میرے ساتھ نمبردار

وغیرہ اور گاؤں میں دو معزز آدمی تھے۔ میں گھوڑے پر سوار تھا۔ اندھیرے میں مجھے ندی کے پار درختوں میں سے مندر کا اُبھرا ہُوا مخروطی مینار نظر آ رہا تھا جو مجھے پُراسرار لگ رہا تھا۔ میں نے بڑے بڑے خوفناک منظر دیکھے ہیں۔ ڈاکوؤں سے مقابلہ ہُوا ہے۔ راتوں کو ایسے جنگلوں سے گزرا ہوں جن میں درندے بھی تھے اور خطرناک ڈاکو بھی لیکن اُس رات اِس صدیوں پرانے مندر کو دیکھ کر مجھ پر ایسا تاثر طاری ہو گیا جیسے میں جِنّوں اور پریوں کے مسکن میں جا رہا ہوں۔ کبھی دل پر ایسا بوجھ آ پڑتا جیسے میں کسی حادثے کا شکار ہونے والا ہوں۔ ناکامی کا خوف مجھے اور زیادہ پریشان کر رہا تھا۔

میں نے گھوڑا ندی میں ڈال دیا۔ دوسرے لوگ بھی ندی میں اُتر گئے۔ ندی گہری نہیں تھی۔ درمیان میں پانی گھٹنوں کو چھوتا تھا۔ موسم گرم تھا اس لئے ندی میں گزرتے کسی کو تکلیف نہ ہوتی۔ پار جا کر میں گھوڑے سے اُترا۔ گھوڑا اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے سب سے کہا کہ وہ پھیل کر مندر کے اِردگرد قریب چلے جائیں۔ میں اکیلا آگے گیا۔ مندر کے اندر روشنی کا گمان ہوتا تھا۔ مجھے اپنا ایک کانسٹیبل ملا۔ اُس نے بتایا کہ پنڈت کو باہر جاتے نہیں دیکھا گیا۔

کانسٹیبل کو ساتھ لے کر میں مندر کے قریب چلا گیا۔ یہ میرا علاقہ تھا۔ میں نے یہ مندر باہر سے دیکھ رکھا تھا۔ اس کے اندر کبھی نہیں گیا تھا۔ یہ ایک اونچے چبوترے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ چبوترہ وسیع و عریض تھا۔ اس کی پانچ چھ سیڑھیاں تھیں۔ اس سے تین چار سو گز پرے مرگھٹ تھا جہاں مرے ہوئے ہندوؤں کو جلایا جاتا تھا۔ ہوا ذرا تیز اور گرم تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے مرے ہوئے ہندوؤں کی بدروحیں مندر کے اردگرد سسک رہی یا سرگوشیاں کر رہی ہوں۔

"کون ہے اوئے!" ــــ مجھے آواز سنائی دی۔

میں نے ٹارچ جلا کر روشنی اُدھر کی۔ مندر کے چبوترے سے پرے دو

چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ ایک سادھو کے حلیے کا آدمی جو لیٹا ہوا تھا، اٹھ بیٹھا۔ اُس نے پھر پوچھا — "کون ہو بے!"

"پنڈت جی مہاراج کہاں ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

ٹارچ کی روشنی اُس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی، اس لئے وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کہا — "پنڈت جی مہاراج سے ملنے کا تمہیں یہ وقت کس نے بتایا ہے؟ .... فوجی ہو؟ چھٹی آتے ہو؟ .... ارے مُنہ سے کچھ بکو۔ بند کر دو یہ روشنی"۔ اس نے اپنی آنکھوں کے آگے ایک بازو رکھ لیا۔ دوسری چار پائی پر جو لیٹا ہوا تھا، وہ بھی جاگ اُٹھا اور بولا — "یہ کون جنگلی ہے"۔

"دونوں اٹھو" — میں نے کہا۔

"داروغہ لگتے ہیں" — دوسری چار پائی والے نے دبی زبان میں کہا۔ اُسے میں نظر آ سکتا تھا کیونکہ ٹارچ کی روشنی اُس کے ساتھی کی آنکھوں پر تھی۔

"اُٹھو اور اندر چلو" — میں نے کہا — "اور مجھے پنڈت کے پاس لے چلو"۔

دونوں بڑی تیزی سے اُٹھے اور مندر کے صدر دروازے کی طرف چل پڑے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے دروازے میں داخل ہوا۔ یہ ڈیوڑھی تھی۔ آگے صحن اور اس کے ارد گرد برآمدہ اور ایک کمرہ عبادت گاہ بنا ہوا تھا۔ صحن میں دیا جل رہا تھا۔ اسی کی مدھم سی روشنی مجھے دُور سے نظر آتی تھی۔ ایک کمرے میں بھی روشنی تھی۔ دونوں آدمی مجھے اس کمرے میں لے گئے۔ فرش پر بڑا پنڈت بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ والے بغیر وردی کانسٹیبل سے کہا کہ ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو اندر لے آئے۔

وہ آئے تو میں نے پنڈت کے چیلوں کو ان کے حوالے کر کے

ڈیوڑھی میں بھیج دیا اور خود پنڈت کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ اُس نے حلیہ تو پنڈتوں اور سادھوؤں جیسا بنا رکھا تھا لیکن تندرست اور توانا آدمی تھا۔ کمرے میں عجیب طرح کی بدبو تھی۔ پنڈت شاید کوئی دوائی بنا رہا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ چھت چیتھڑوں جیسے جالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھے تنگ سے اس کمرے میں ہیبت دکھائی دی۔ پنڈت کے چہرے پر گھبراہٹ آ گئی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیوں آیا ہوں۔

"سُندری کو لینے" — میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"سُندری؟" — اُس نے حیران ہو کر پوچھا — "کون سُندری؟ اس وقت تو یہاں کوئی جوان لڑکی نہیں آئی؟"

"پنڈت جی مہاراج!" — میں نے کہا — "مجھے صرف یہ بتا دیں کہ آپ کو میرے بتائے بغیر کِس طرح پتہ چل گیا ہے کہ میں جس سُندری کی بات کر رہا ہوں وہ جوان لڑکی ہے؟"

آدمی ذہین تھا۔ مخمور سی ہنسی ہنس کر بولا — "تم کیا سمجھتے ہو ہم کسی کے دل کی بات نہیں بتا سکتے؟ تم آدھا سوال کرو، ہم پورا جواب دیں گے۔ کہو تو تمہارے من کی دو اور باتیں بتا دیں" — اس کی آواز ایسے ہوتی گئی جیسے اُس پر نشہ طاری ہو رہا ہو۔ کہنے لگا — "اپنے من کی چنتا نہ بتاؤ، ہم بتا دیں گے"۔

"میرے من کی چنتا یہ ہے مہاراج کہ مجھے سُندری سے ملا دیں" — میں نے کہا۔

اُس کے ہونٹوں پر مستانہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ وجدانی سے لہجے میں بولا — "ہم سے بیکار باتیں نہ کرو۔ من کی مُراد مانگو"۔

میں نے اُس کے کندھے پر دھپ سے ہاتھ رکھا تو وہ ہل گیا۔ میں نے کہا — "ہوش میں آؤ پنڈت! تم نے دیکھ لیا ہے میں کون ہوں، اور تم جان گئے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ لڑکی میرے حوالے کر دو۔ میں

رات کے اندھیرے میں تمہارے جُرم پر پردہ ڈال دوں گا۔"

"میں کسی سُندری کو نہیں جانتا"—اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں اُن لڑکیوں کو بلا لوں گا جن کے ساتھ سُندری یہاں آیا کرتی تھی"—میں نے کہا—"اور تم اُسے الگ کمرے میں لے جایا کرتے تھے"—میں نے آگے ہوکر رازداری سے پوچھا—"اُس کے بچّے کے باپ تم ہونا!"

اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا لیکن وہ بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو"—اُس نے کہا—"سارے مندر میں گھوم جاؤ.... جاؤ دیکھ آؤ۔ یہاں تمہیں کوئی سُندری نہیں ملے گی۔ تم مسلمان ہو۔ مندر کی توہین کر رہے ہو۔ تم یہ سمجھ کر آئے ہو کہ ہم نے یہاں لوگوں کی لڑکیاں چھپا کر رکھی ہوئی ہیں؟ مندر میں پولیس کا رعب نہیں چلے گا۔"

"پھر تمہیں تھانے لے چلوں گا"—میں نے کہا—"میں اتنی آسانی سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ تم جھوٹ بول کر اپنے خلاف شک پیدا کر چکے ہو۔"

وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا۔ مجھے اس پر پختہ شک ہو گیا تھا۔ اس نے سُندری کا نام سُن کر ہی کہہ دیا تھا کہ اس وقت یہاں کوئی جوان لڑکی نہیں آتی۔ اُس نے یہ تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا کہ سُندری مندر میں آتی ہے۔ میری نظر اور میری سوچ پولیس کی تھی۔ میں نے اُس پر سوالوں سے حملہ کر دیا لیکن وہ مان نہیں رہا تھا۔

پُراسرار نقاب پوش

میں نے اُسے وہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور اس کے چیلوں میں سے

ایک کو ڈیوڑھی میں لے گیا۔ وہ اب دو کی بجائے تین تھے۔ اس چیلے سے میں نے کہا—"تمہارا پنڈت بڑا ہی کچا آدمی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اتنی جلدی نہیں مانے گا لیکن اس نے صاف بتا دیا ہے کہ لڑکی کہاں ہے۔ اس نے جُرم کا سارا بوجھ تم تین آدمیوں پر ڈال دیا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟"—اُس نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا"—میں نے کہا—"تم مجھے صحیح بات بتا دو۔ اس واردات میں تمہارا جو ہاتھ ہے وہ بتا دو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔ اگر مجھے چکر دینے کی کوشش کرو گے تو کامیاب نہیں ہو سکو گے اور میرے ہاتھوں بہت نقصان اُٹھاؤ گے۔ یہ بھی سوچ لو کہ تمہارا پنڈت تم تینوں کو پھانسنے اور اپنی جان چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے .... اور یہ بھی سوچ لو کہ میں اَوتار یا فرشتہ نہیں کہ غیب کا اشارہ ملا اور میں یہاں آ گیا۔ مجھے اس مندر کے بھیدیوں نے اِدھر کا راستہ دکھایا ہے۔ لڑکی یہاں سے غائب کی گئی ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

اگر تجربے سے فائدہ اٹھایا جاتے اور انسان کی کمزوریوں پر نظر رکھ کر عقل سے کام لیا جاتے تو کسی بھی مشتبہ کے پاؤں تلے سے زمین نکالنا مشکل نہیں ہوتا۔ پولیس کا رعب اور خوف بھی پورا کام کرتا ہے۔ میں نے پنڈت کے اس چیلے سے ایسی ایسی باتیں کہیں کہ اس کے چہرے پر مجھے بے چینی کے بڑے صاف تاثرات نظر آنے لگے۔

"آپ ندی پار والے گاؤں کی لڑکی کی بات کر رہے ہیں؟"—اُس نے پوچھا—"وہ جو صبح سویرے یہاں آیا کرتی تھی؟"

"ہاں، وہی ہے۔"

"جنابِ والا!"—اُس نے پوچھا—"پنڈت کیا کہتا ہے کہ میں نے اس لڑکی کو غائب کیا ہے؟"

"اس کے علاوہ اس نے تمہارے خلاف اور بھی بہت سی باتیں

کہی ہیں"—میں نے اُسے بھڑکانے کے لئے کہا۔

"چلئے"— وہ بولا—"اُس کے سامنے بات کرتے ہیں۔"

"پہلے مجھے بتادو کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو"—میں نے کہا—"پھر اس کے سامنے بات کریں گے۔"

"مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ لڑکی تین چار لڑکیوں کے ساتھ صبح سویرے یہاں آیا کرتی تھی"—اس نے کہا—"اور پنڈت اُسے الگ کمرے میں لے جاتا تھا۔ لڑکی کچھ دیر بعد وہاں سے نکلتی تھی۔"

"پنڈت تمہارا گہرا دوست ہے"—میں نے کہا—"تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ پنڈت اُسے اُس کمرے میں کیوں لے جاتا تھا۔ تم نے پنڈت سے ضرور کہا ہوگا کہ کبھی تمہیں بھی اس لڑکی کے ساتھ الگ کمرے میں لے جائے... مجھے ہر ایک بات بتاؤ، ورنہ ایسے پھنسو گے کہ دس سال کے لئے اندر ہو جاؤ گے۔"

"کہا تھا حضور!"—اُس نے کہا—"آپ نے مجھے بچانے کا وعدہ کیا ہے تو میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میں نے پنڈت سے کہا تھا کہ وہ اکیلے اکیلے عیش کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ چل کر دیکھ لینا، یہ کسی اور کا مال ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟—اُس نے کہا کہ وہ اپنا ہی آدمی ہے لیکن یہ بتانا مناسب نہیں کہ وہ کون ہے، کہاں سے آتا اور کہاں جاتا ہے.... میں نے اُس سے بہت پوچھا کہ کچھ تو بتا دے لیکن اس نے نہیں بتایا۔ میں نے ایک بار دیکھا۔ لڑکی پنڈت کے ساتھ کمرے میں گئی لیکن پنڈت کو میں نے ایک اور کمرے میں تنہا دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد لڑکی اُس کے کمرے سے نکلی۔ میں مندر کے پچھواڑے چلا گیا۔

اندر سے ایک آدمی نکلا جس کا منہ اور سر چادر سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ چلا گیا اور درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ پھر میں نے اُسے گھوڑے پر سوار دیکھا اور وہ غائب ہو گیا۔"

"تم نے اس آدمی کو ایک ہی بار دیکھا تھا؟"

"کئی بار"—اُس نے جواب دیا—"دس پندرہ دنوں بعد آتا تھا۔ ہم یہاں تین آدمی ہیں تینوں نے پنڈت سے پوچھا تھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ پنڈت نے ہمیں نہیں بتایا۔ کہتا تھا کہ تم لوگوں کو یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میری باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔ ہم چپ ہو گئے اور ہم سمجھ گئے کہ یہ آدمی اس لڑکی سے ملنے آتا ہے اور جب آتا ہے، پنڈت لڑکی کو کمرے میں لے جا کر خود اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔"

"دو روز پہلے لڑکی رات کو یہاں آئی تھی؟"

"بہت دنوں سے نہیں آئی"—اُس نے جواب دیا—"رات کو کبھی نہیں آئی۔"

میں نے اس پر بہت جرح کی۔ اسے گھیرنے کی پوری کوشش کی لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ جو کچھ بتا چکا ہے اس کے سوا اسے کچھ اور معلوم نہیں۔

سُندری اُس کے پاس چلی جاتی تھی

اُسے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر کے دوسرے آدمی کو ڈیوڑھی میں بلایا۔ یہ کچھ ڈھیٹ نظر آیا۔ میں نے جھک جھک اور دماغ سوزی سے بچنے کے لئے اس کے پہلے ساتھی کو بلا لیا اور اُسے کہا کہ اپنے اس دوست سے کہو کہ بیکار قلابازیاں نہ کھائے۔ صاف بات کرے۔

پہلے چیلے نے پنڈت کو بُرا بھلا کہا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ جو کچھ جانتا ہے بتا دے۔ چنانچہ وہ جو کچھ جانتا تھا اُس نے بتا دیا۔ میں نے ان کے تیسرے ساتھی کو بُلا لیا۔ اُس نے مجھے پریشان نہ کیا۔ یہ آدمی پنڈت کے زیادہ قریب معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بیان اس کے ساتھیوں کے بیان کی تصدیق تھی۔ اس سے مزید یہ معلوم ہوا کہ سُندری نے مندر میں آنا شروع کیا تو چند دنوں بعد ایک آدمی جو گھوڑے پر سوار تھا، مندر میں آیا۔ اس نے سُندری کو دیکھ لیا اور پنڈت کے ساتھ بات کی۔ پنڈت سُندری کو الگ کمرے میں لے گیا

اور اُسے اُس آدمی سے ملایا — یہ سُندری کی گمشدگی سے ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

اس کے بعد سُندری اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر صبح ندی پہ جاتی رہی۔ ندی پر عورتیں مُنہ اندھیرے جایا کرتی تھیں تاکہ کوئی مرد نہ دیکھ سکے۔ سُندری کا بھی یہی وقت تھا۔ ندی سے وہ مندر میں چلی جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ آدمی صبح کی نیم تاریکی میں آجاتا اور مندر کے ایک کمرے میں جا بیٹھتا تھا۔ سُندری اس کے پاس چلی جاتی اور پنڈت اِدھر اُدھر ہو جاتا تھا۔ وہ آدمی زیادہ دیر نہیں رکتا تھا۔

"وہ کس عمر اور حُلیے کا آدمی ہے؟"

"میں ایک بار بھی اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا" — اُس نے جواب دیا — "اُس کے سر، چہرے اور کندھوں پہ سیاہ کپڑا ہوتا ہے۔ ہاتھوں سے پتہ چلتا ہے کہ جوان آدمی ہے۔ قدبُت آپ جیسا ہے۔ (دراز قد اور توانا) وہ گھوڑا مندر سے تھوڑی دُور درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھوڑ آتا ہے۔"

"تم نے پنڈت سے پوچھا ہوگا کہ یہ کون ہے؟"

"صرف ایک بار پوچھا تھا" — اُس نے جواب دیا — "پنڈت نے کہا تھا کہ آج پوچھا ہے، آئندہ نہ پوچھنا۔ اپنے کام سے کام رکھو۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ لڑکی اس نقاب پوش کے ساتھ چلی گئی ہے؟"

"مجھے بالکل معلوم نہیں" — اُس نے التجا کے لہجے میں کہا — "جہاں سب کچھ اگل دیا ہے وہاں یہ بھی بتا دیتا۔ مجھے اس کے چلے جانے کا کوئی علم نہیں۔"

پنڈت بھی غائب ہوگیا

یہ تفتیش کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ یہ واضح ہوگیا تھا کہ لڑکی کی گمشدگی میں پنڈت نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ مجھے ان سب کے مکمل بیان ابھی

لینے تھے۔ ان تینوں کا اب صرف حُلیہ سادھوؤں جیسا رہ گیا تھا۔ ان کے بولنے کا انداز اور لب و لہجہ بالکل وہ ہو گیا تھا جس سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ یہ پیشہ ور مجرموں کا انداز اور لہجہ تھا۔ میرے وعدوں، حوصلہ افزائی اور تسلیوں سے متاثر ہو کر وہ اب سرکاری مخبروں کی طرح باتیں کرنے پہ آ گئے تھے۔

مجھے اب یہ کارروائی کرنی تھی کہ گاؤں کے جو لوگ باہر کھڑے تھے ان کی موجودگی میں مجھے مندر کی تلاشی لینی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ لڑکی مندر کے کسی کمرے میں ہوگی۔ تلاشی کے بعد مجھے پنڈت اور اُس کے تینوں ساتھیوں کو تھانے لے جانا تھا۔ میں نے اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ آتے ہُوئے سٹاف کے حوالے کر دیا اور پنڈت کے کمرے میں گیا۔ دیا جل رہا تھا، پنڈت نہیں تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے ایک خطرناک غلطی کی تھی۔ پنڈت پہ مجھے ایک کانسٹیبل کا پہرہ کھڑا کرنا چاہیئے تھا جو میں نے نہ کیا۔

میں نے پنڈت کو آوازیں دیں۔ صحن میں آکر پکارا۔ اُس کی آواز بھی مجھے سنائی نہ دی۔ سب دوڑے آئے۔ میں نے پنڈت کے ایک ساتھی کو مندر کی تلاشی کے لئے ساتھ لیا۔ وہاں بہت سے کمرے تھے۔ یہ اُس دور کا مندر معلوم ہوتا تھا جب ہندوستان پہ ہندوؤں کی حکمرانی تھی۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ اس ویرانے میں اتنا بڑا مندر کیوں تعمیر کیا گیا تھا۔

پنڈت کا ساتھی مجھے اُسی کمرے میں لے گیا جہاں میں نے پنڈت کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھی نے بتایا کہ وہ اس دروازے سے نکلا ہوگا۔ مجھے اس طرف سیاہ کالی لکڑی کا ایک دروازہ نظر آیا جو کھُلا ہُوا تھا۔

چیلے نے دیا اُٹھا لیا۔ میرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ میں دوسرے کمرے میں گیا تو وہاں دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ ان پہ بستر بچھے تھے۔ ایک طرف دو ٹرنک پڑے تھے۔ کچھ اور سامان بھی تھا۔ یہ رہائشی کمرہ تھا — پنڈت وہاں

نہیں تھا۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ ہر جگہ پنڈت کو ڈھونڈیں۔ مجھے شک ہو گیا تھا کہ میری کوتاہی سے وہ نکل گیا ہے ..... اس کمرے سے پنڈت کا چیلہ مجھے اگلے کمرے میں لے گیا۔ یہ بالکل تاریک اور ویران تھا۔ ٹارچ اور دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں ایسے لگتا تھا جیسے یہ کمرہ نہیں غار ہو۔ چھت پر بڑے ہی گھنے اور پرانے جالے تھے۔ وہاں سے ہم ایک اور کمرے میں چلے گئے۔ اچانک بڑی زور سے پھڑپھڑ ہوئی جیسے تین چار آدمی اٹھ کر دوڑ پڑے ہوں۔ میں نے بجلی کی تیزی سے ریوالور نکالا اور للکار کر کہا — "رک جاؤ، گولی مار دوں گا"

"چمگادڑ ہیں حضور!" — میرے گائیڈ نے کہا۔

میں کھسیانہ سا ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی اوپر کی تو کبوتروں جتنے بڑے چمگادڑ جالوں میں سے نکلتے، اڑتے اور وہ جالوں میں ہی غائب ہوتے دکھائی دیتے۔ ان کی "چی چی" جیسی آوازیں ڈراؤنی تھیں۔ پنڈت وہاں نہیں تھا۔

مجھے ایسے بہت سے کمروں میں لے جایا گیا۔ میں ایک کمرے میں رک گیا کیونکہ ساتھ والے کمرے میں کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ کواڑ کو نہایت آہستہ سے دھکیلا۔ کواڑ نے بڑی زور سے "کررر" کی آواز پیدا کی۔ ادھر سے آواز آئی — "جہاں کھڑے ہو کھڑے رہو۔ گولی چل جائے گی" — یہ میرے ہیڈ کانسٹیبل کی آواز تھی۔ میں سکون کا سانس لے کر آگے بڑھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے پاس بھی ٹارچ تھی۔ وہ بھی کئی کمرے دیکھ آیا تھا۔

"وہ پچھلے دروازے سے نکل گیا ہو گا" — پنڈت کے ایک اور ساتھی نے کہا — "آیئے آپ کو وہ دروازہ دکھاتا ہوں"

کمروں میں سے گھما پھرا کر وہ ہمیں پچھلے دروازے تک لے گیا۔ میں جان گیا کہ پنڈت کمروں کے اندر اندر سے نکل گیا ہے۔ صحن میں میرے

سٹاف کے آدمی تھے۔ اتنا وقت گزر گیا تھا کہ اب پنڈت کا تعاقب ناممکن تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سمت گیا ہے۔ رات تاریک تھی۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن چار میل دور تھا۔ ادھر ادھر لاریاں بھی وہیں سے جاتی تھیں۔ میں نے سٹیشن پہ ایک کانسٹیبل اور گاؤں کا ایک آدمی بھیج دیا۔ میں اس وقت یہی کچھ کر سکتا تھا۔

پہیرا ایک ہی ہے

میں گاؤں سے جو آدمی ساتھ لایا تھا، انہیں اندر بلایا اور سب کو پنڈت کے رہائشی کمرے میں لے گیا۔ ٹرنکوں کے تالے توڑ کر تلاشی لی۔

ایک ٹرنک میں سے ایک تھیلی برآمد ہوئی۔ اس میں سے سو سو اور دس دس روپوں کے نوٹ نکلے۔ گنے تو رقم پورے دو ہزار تھی۔ سونے کے دو کڑے اور ایک زنانہ انگوٹھی بھی برآمد ہوئی۔ دوسرے ٹرنک میں پنڈت کا ذاتی سامان تھا اور اس میں دیسی شراب کی چار بوتلیں رکھی تھیں۔ میں نے نمبردار سے کہا کہ سندری کے سسر، خاوند اور ساس کو بلا لائے۔ اس دوران برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کر لیا۔ پنڈت کے تینوں چیلوں کے سامان کی بھی تلاشی لی۔ ہر ایک کے سامان سے تھوڑی تھوڑی رقم اور چرس نکلی۔ میرے کام کی کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔

سندری کا سسر، ساس اور خاوند آ گئے۔ میں نے انہیں رقم والی تھیلی، کڑے اور انگوٹھی دکھائی۔ سسر نے تھیلی پہچان لی۔ یہ اسی کی تھی۔ میں نے رقم تھیلی میں ڈال دی تھی۔ سسر نے بتایا کہ اس میں اتنے نوٹ سو سو کے اور اتنے دس دس کے ہوں گے۔ اس نے بالکل ٹھیک بتایا تھا۔ سندری کی ساس نے کڑے اور انگوٹھی دیکھ کر کہا کہ یہ چیزیں سندری کی ہیں۔

مندر کے اندر اور باہر پہرے کا انتظام اس طرح کیا کہ دو کانسٹیبل

رائفلوں سے مسلح مندر کے اندر رہیں کسی کو پتہ نہ چلے کہ اندر مسلح پہرہ ہے۔ دو کانسٹیبلوں کو دیہاتی لباس میں مندر پر باہر سے نظر رکھنے کے لئے مقرر کر دیا۔ انہیں کہا کہ وہ گاؤں سے دو چار مویشی لے لیں اور مندر کے اردگرد اس طرح موجود رہیں کہ کسی کو ان پر شک نہ ہو اور وہ مندر سے دُور رہیں لیکن ان کی نظر مندر پر رہے۔

میں سب کو تھانے لے گیا۔ پنڈت کے اُس ساتھی کو جو میری نظر میں دوسروں سے ذہین اور پنڈت کے زیادہ قریب معلوم ہوتا تھا میں نے الگ کر لیا اور اُسے کہا کہ اُس نے کچھ باتیں مجھ سے چھپا رکھی ہیں اور اب وہ دل کی ہر ایک بات بتا دے۔ اس سے پہلا سوال یہ کیا کہ پنڈت کہاں گیا ہے اور اُس کا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے۔

اُس نے ہاتھ جوڑ کر اور اپنے مذہب کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ اُسے جو کچھ معلوم تھا، وہ بتا چکا ہے۔ اُسے پنڈت کے ٹھکانے کا کوئی علم نہیں تھا۔

"میں کس طرح مان سکتا ہوں کہ اتنے لمبے ساتھ میں تمہیں یہ بھی پتہ نہ چلا ہو کہ پنڈت کہاں کا رہنے والا ہے!"

"جہاں تک میں جانتا ہوں، اُس کا اس مندر کے سوا کوئی اور ٹھکانہ نہیں" — اُس نے کہا — "اڑھائی سال گزرے وہ مجھے متھرا میں ملا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ متھرا ہمارا مقدس مقام ہے۔ وہاں دُور دُور سے پنڈت وغیرہ عبادت کے لئے آتے ہیں۔ میرے ساتھ اس کی اتفاقیہ ملاقات ہوتی تھی۔ مجھے آپ نے مندر سے پکڑا ہے اس لئے آپ مجھے ہندو سمجھتے ہیں۔ میرا کوئی مذہب نہیں۔ میرے ان دونوں ساتھیوں کا بھی کوئی مذہب نہیں۔ ہمارا مذہب پیٹ ہے۔ میں سادھو مہنت صرف اس لئے بنا تھا کہ جو عیش ہندو کراتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کرا سکتا۔

ہندوؤں کی عورتیں سادھوؤں کی بہت سیوا کرتی ہیں۔ وہ اپنے گھر دولت سے بھر لینا چاہتی ہیں اور آنے والے وقت کا حال معلوم کرنے کے لئے

جو مانگو دے دیتی ہیں....

"میں پنجاب میں آپ کے ایک پیر کا بھی چیلہ رہ چکا ہوں۔ اُس کے مرید سینکڑوں نہیں ہزاروں تھے۔ اب تک اور زیادہ ہو چکے ہوں گے۔ مریدوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اُن کی عقیدت کا حال بھی دیکھا جو آپ ہندو عورتوں میں دیکھتے ہیں لیکن ان پنڈتوں اور پیروں کی جو اصلیت ہے، اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کے ہاں مرے ہوئے پیروں فقیروں کے عُرس ہوتے ہیں۔ وہاں مجاور اور پیروں کے خاص مرید جو شکار کھیلتے ہیں، وہ صرف میں جانتا ہوں۔ بعض عورتیں عقیدت کے پردے میں عیاشی کے لئے عُرسوں پر اور پیروں کے حجروں میں جاتی ہیں....

"یہی کھیل گنگا کے کنارے بنارس، ہردوار اور متھرا وغیرہ میں کھیلے جاتے ہیں جہاں ہندو مرد، عورتیں اور جوان لڑکیاں دُور دُور سے آتی ہیں۔ وہاں پنڈتوں اور سادھوؤں کی ایک فوج اُتری ہوئی ہوتی ہے۔ ان میں ہمارے پنڈت جیسے اور مجھ جیسے مذہبی پیشوا اور سادھو بھی ہوتے ہیں۔"

اِس شخص نے شاید مجھے خوش کرنے کے لئے اتنی لمبی بات شروع کر دی تھی۔ میں نے اُسے روکا نہیں۔ اس قسم کے مجرم جب بولنے لگتے ہیں تو بڑے کام کی باتیں بتا دیتے ہیں۔ یہ آدمی ہندوؤں اور مسلمانوں کی توہم پرستی کی بڑی صحیح تصویر پیش کر رہا تھا۔ یہ تصویر آج بھی ویسی ہی نکھری ہوتی ہے جیسی میری جوانی کے وقت تھی۔ سائنس اور علم کی فراوانی کے باوجود اس گھناؤنی تصویر میں پھیکا پن پیدا نہیں ہُوا بلکہ اس کے رنگ اور زیادہ شوخ ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں نے یہ توہم پرستی اور پیر پرستی ہندوؤں سے سیکھی تھی۔ مسلمانوں کو خدا نے ایک پیر دیا اور ایک کتاب دی ہے۔ یہ پیر خدا کے رسول صلعم ہیں اور کتاب قرآن ہے۔ ان سے فیض حاصل کیا جائے تو آپ کے سامنے غیب

کے پردے اور آپ کی اپنی ذات کے پردے چاک ہو جائیں گے اور آپ کی ہر مُراد پوری ہو گی۔

بدرُوحوں اور بھُوتوں کی حقیقت

مفرور پنڈت کا یہ چیلہ کہہ رہا تھا — "اس پنڈت کو میں نے متھرا میں دیکھا تو مجھے شک ہُوا کہ شکاری ہے۔ یہ جڑی بوٹیوں کی سمجھ بُوجھ رکھتا تھا۔ باتیں ایسی کر سکتا تھا جیسے اُسے ہر کسی کا مستقبل نظر آ رہا ہو۔ میں سادھو بنا ہُوا تھا۔ ننگے جسم پر راکھ مل رکھی تھی۔ ماتھے پر لال رنگ سے 'اوم' لکھ رکھا تھا۔ میں اس پنڈت کے قریب ہُوا تو بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ یہ کہنے لگا کہ دیہاتی علاقے میں کوئی مندر مِل جاتے تو وارے نیارے ہو جائیں ....

"ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اصلیت بتا دی۔ میرے ان دو ساتھیوں میں سے ایک وہیں تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایک پنڈت ہاتھ آ گیا ہے۔ اب کوئی مندر یا آشرم مِل جاتے تو عیش ہو جاتے۔ اُس نے مشورہ دیا کہ دیہاتی علاقے میں کسی گُپھ یا غار میں جا ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ اس دوران ہمیں تیسرا ساتھی مل گیا۔ یہ اس علاقے سے واقف تھا۔ اس نے بتایا کہ اس علاقے میں ایک بہت پُرانا اور ویران مندر ہے جس سے لوگ ڈرتے ہیں کہ اس میں اُن مرے ہوئے ہندوؤں کی بدروحیں رہتی ہیں جنہیں قریب ہی مرگھٹ میں جلایا جاتا ہے، اس لئے اس مندر کو کوئی پنڈت آباد نہیں کرتا ....

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ بدروحوں اور بھُوتوں کی حقیقت کیا ہے۔ ہم نے پنڈت سے مل کر فیصلہ کیا کہ اس مندر میں چلے چلتے ہیں۔ ہم یہاں آ گئے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ پنڈت کی اس ہنرمندی کو میں مانتا ہوں کہ بیماریوں اور جڑی بوٹیوں کو خوب سمجھتا ہے۔ مندر میں آئے

تو اس کی ہیبت نے ہمیں ڈرا دیا۔ شک ہونے لگا کہ یہاں بدروحیں اور بھوت رہتے ہوں گے۔ ہم نے تین چار کمرے صاف کئے اور اسے اس حالت میں لے آئے جس میں آپ نے دیکھا ہے ....

"ہم تینوں ساتھی سادھوؤں کا بہروپ اُتار کر دیہاتی کپڑوں میں قریب کے گاؤں میں نکل گئے۔ ہم نے لوگوں کو سُنایا کہ پُرانے مندر میں ایک پنڈت آیا ہے جو ہر مُراد پوری کرتا ہے اور جو عورت پیدائشی بانجھ ہو، اُسے بھی بچّہ دے دیتا ہے۔ میرے ساتھیوں نے یہ مشہور کیا کہ یہ پنڈت کسی مرے ہُوئے سنیاسی کی دوسری جُون ہے، یعنی کسی سنیاسی نے دوسرا جنم لیا ہے اور وہ ہر مرض کا علاج کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دیہات کے لوگ کتنی جلدی متاثر ہوتے ہیں۔ وہ مندر میں آنے لگے۔ ہم تینوں چیلے بن گئے۔ یہ پنڈت سنیاسی بھی تھا اور پنڈت بھی۔ اس نے پراتھنا (عبادت) بھی شروع کر دی۔ مسلمان بھی مندر میں دوائیوں اور مُرادیں پوری کرانے کے لئے آنے لگے ....

"ہم نے بے اولاد عورتوں کو اولاد دینے پر زیادہ توجّہ دی۔ کئی عورتوں کو ہم سے اولاد ملی۔ اس اولاد کے باپ ہم ہیں لیکن اِن عورتوں کے خاوندوں نے مندر میں آ کر پنڈت کے پاؤں میں ماتھے رگڑے اور ہمیں گندم، چاول، مکھن، انڈے اور پیسے دیتے۔ پھر یہ لڑکی جس کا نام سُندری ہے، اپنی سہیلیوں کے ساتھ آنے لگی۔ میں نے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پنڈت نے بتایا کہ یہ بھی اولاد کے لئے آتی ہے۔ ایسا شکار ہمیں کبھی نہیں ملا تھا، مگر پنڈت نے ہمیں سختی سے کہا کہ اس لڑکی سے دُور رہنا، یہ کسی اور کا مال ہے ....

"ہم تینوں نے پنڈت کے ساتھ تکرار کی کہ وہ ہمیں اس شکار میں سے حصہ نہیں دے رہا۔ اس دوران میں نے اُس آدمی کو مندر کے پچھلے دروازے سے نکلتے دیکھا جِس کے سر، چہرے اور کندھوں پر سیاہ کپڑا پڑا تھا۔ یہ قصہ آپ کو سُنا چکا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ پنڈت سُندری کا

سودا کر رہا ہے۔ میں نے اس سیاہ پوش کو کئی بار دیکھا۔ وہ پچھلے دروازے سے نکلتا تھا اور سُندری لڑکیوں کے ساتھ سامنے والے دروازے سے آتی جاتی تھی۔ میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ پنڈت ہمیں دھوکہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ سُندری کو الگ کمرے میں لے جا کر خود وہاں سے نکل جاتا تھا۔ وہ سُندری کو اُسی روز دوسرے کمرے میں لے جاتا تھا جس روز سیاہ پوش آیا ہُوا ہوتا تھا۔ پھر آج رات آپ آگئے اور پتہ چلا کہ سُندری گھر سے غائب ہے۔"

تندرست، توانا خاوند — اندر سے کھوکھلا

اِس شخص نے اپنا بیان یہاں پر ختم کر دیا۔ میرا مسئلہ جُوں کا تُوں رہا۔ میں تو یہ معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھا کہ یہ سیاہ پوش کون تھا اور وہ کہاں سے آتا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا۔ صرف پنڈت کو معلوم تھا مگر پنڈت فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے دوسرے دو ساتھیوں کے بیان لئے۔ اُنھوں نے اپنے اس ساتھی کے بیان کی تصدیق کر دی مگر سیاہ پوش معمّہ بنا رہا۔ پنڈت نے اِن تینوں کو نہیں بتایا تھا کہ اُس نے دو ہزار روپیہ، سونے کے کڑے اور انگوٹھی سُندری سے وصول کی ہے۔ یہ رقم اور زیورات سُندری کے ہی تھے۔

رات انہی کے ساتھ گزر گئی۔ میں نے پنڈت اور سُندری کے حُلیے اور عمریں معلوم کر کے اشتہارِ شور و غوغا HUE & CRY NOTICE تیار کر کے اس کی نقلیں اپنے بالائی حکام اور ضلعے کے تمام تھانوں میں بھیجنے کا بندوبست کیا۔ کسی کی گمشدگی یا فرار کی صورت میں تمام تھانوں کو مطلع کیا جاتا ہے جسے اشتہارِ شور و غوغا کہتے ہیں۔ تمام تھانے گمشدہ یا مفرور فرد کی تلاش میں مدد دیتے ہیں۔

تھانے میں اور کیس بھی تھے۔ کچھ اور کام بھی تھے، مَیں ان میں مصروف ہو گیا۔ سُندری کی گمشدگی کے متعلق بھی تفتیش ہوتی رہی۔ مُخبر

اپنی کارگزاری کی رپورٹیں دیتے رہے۔ کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ سُندری کا چال چلن مشکوک تھا۔ ہر کسی سے اُس کی تعریف سُنی۔ میرے کانوں میں یہی ڈالا جاتا رہا کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی، اُسے زبردستی اغوا کیا گیا ہے۔ میں یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن اب جب کہ ایک سیاہ پوش کا بھی ذکر کیا جانے لگا تھا تو مجھے شک ہونے لگا کہ سُندری کو زبردستی اغوا کیا گیا اور کسی گھر بھیدی نے ٹرنکوں سے رقم اور زیورات نکلوائے ہیں۔ یہ سیاہ پوش کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یہ کوئی نامی گرامی ڈاکو لگتا تھا۔

پانچ چھ دن گزر گئے۔ میں نے اس دوران سُندری کے باپ اور اُس کی ماں کے ساتھ بھی طویل گفتگو کی تھی۔ اُس کے سُسر، ساس اور خاوند کے ساتھ بھی مزید باتیں ہوتی تھیں۔ ان سب سے پتہ چلا تھا کہ سُندری کو خاوند اکثر مارتا پیٹتا تھا۔ سُندری کی ماں سے معلوم ہُوا کہ سُندری نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا خاوند وحشی ہے۔ اُسے یہ وہم ہو گیا تھا کہ سُندری اُسے پسند نہیں کرتی اور کسی اور کو چاہتی ہے۔ میں نے اُس کے خاوند سے پوچھا کہ کیا واقعی وہ کسی کو چاہتی تھی؟ اُس نے کوئی تسلّی بخش جواب نہ دیا۔ میری جرح نے مجھ پر واضح کیا کہ یہ خاوند جو بظاہر خوبرو، تندرست اور توانا ہے۔ اندر سے کھوکھلا ہے۔ اس قسم کے خاوند اپنا علاج کرانے کی بجائے بیویوں پر ظلم و تشدّد کرتے ہیں۔ یہ اپنی مردانگی کی دھاک بٹھانے کا ایک لاشعوری طریقہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بیویاں اُن کی وفادار نہیں۔

زندہ عورت یا بدرُوح؟ — میں ڈر گیا

چھٹی یا ساتویں رات کا واقعہ ہے — میں نے جن آدمیوں کو مندر کے اندر اور باہر پہرے پر چھوڑا تھا، ان میں سے ایک گھبرایا

ہُوا اٹھانے آیا۔ وہ میرا ایک ہندو کانسٹیبل تھا۔ اُس کے پاس رائفل تھی۔ اُس نے بتایا کہ مندر کے اندر سے ایک عورت کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں اور ایک بچّہ بھی روتا ہے۔

"تم نے اندر جاکر دیکھا نہیں وہ کون ہے؟"— میں نے پوچھا — "میں نے تمہیں لالٹینیں اور ٹارچیں دے رکھی ہیں۔"

"یہ کسی زندہ انسان کی آوازیں نہیں ملک صاحب!"— کانسٹیبل نے کہا — "یہ کسی ماں کی بدرُوح معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا، لوگ کہتے ہیں کہ پُرانے مندر میں بدروحیں اور بھوت رہتے ہیں .... یہ کوئی زندہ عورت ہوتی تو ہمارے سامنے اندر جاتی۔ ہم نے اُسے ڈیوڑھی اور صحن سے گزرتے نہیں دیکھا۔"

"تمہارے ساتھ والا دوسرا کانسٹیبل کہاں ہے؟"

"وہ مندر سے باہر نکل آیا تھا"— اُس نے جواب دیا — "وہ اُن دو آدمیوں کے ساتھ مندر سے کچھ دُور بیٹھا ہے جنہیں آپ نے مندر کے باہر رہنے کو کہہ رکھا ہے۔"

یہ ایسا موقع تھا کہ میرے قدم ڈگمگا سکتے تھے مگر میرے اُوپر انگریز کی بدروح سوار تھی۔ مجھے مندر میں جاکر دیکھنا تھا کہ یہ کسی زندہ عورت کی آواز ہے یا واقعی یہ بدرُوح ہے۔ میں نے حقائق پر غور کیا۔ مندر کے پیچھے بھی ایک دروازہ تھا۔ یہ عورت اُدھر سے آتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کوئی مظلوم ہو۔ کانسٹیبل نے کہا تھا کہ اُس کے ساتھ بچّے کے رونے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں نے بہت سوچا۔ کچھ پلّے نہ پڑا کہ یہ عورت کہاں سے اندر آگئی ہے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ یہ کانسٹیبلوں کا وہم ہوگا جسے وہ حقیقی سمجھ رہے ہیں۔ رونے کی آواز مندر میں سے گزرتی ہوئی ہوا کے تیز جھونکوں سے بھی پیدا ہوسکتی تھی۔

میں بدرُوحوں کا قائل نہیں تھا میں نے گھوڑا تیار کرایا۔ اے۔ ایس۔ آئی اور چند ایک کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور پرانے مندر کو روانہ ہوگیا۔ راستے

میں مجھے اے۔ ایس۔ آئی نے کہا کہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی بدرُوح ہوگی اور ہمیں نقصان پہنچائے گی۔ اے۔ ایس۔ آئی ہندو تھا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ بعض مرے ہُوئے لوگ مختلف جانوروں کے رُوپ میں دُنیا میں آتے ہیں، بعض انسان کے روپ میں نیا جنم لیتے ہیں اور بعض کی بدرُوحیں آجاتی ہیں۔

میں اُس کے عقیدے کا قائل نہیں ہو رہا تھا لیکن میرا دل خوف سے آزاد بھی نہیں تھا۔ میں نے مندر کے قریب جاکر آیۃ الکرسی کا وِرد شروع کردیا، پھر مختلف آیات پڑھتا رہا۔ مجھے اپنے اللہ اور اُس کے کلام پر بھروسہ تھا۔ گھوڑوں سے اُتر کر میں اور اے۔ ایس۔ آئی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ ہمارے پیچھے مندر کی ڈیوٹی والے کانسٹیبل تھے۔ ہم ڈیوڑھی میں سے گزر رہے تھے تو ایک عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ مجھے جیسے آگے سے دھکّا لگا ہو۔ میں نے جو قدم اُٹھایا تھا وہ پیچھے آگیا۔ اے۔ ایس۔ آئی تین چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ہمارے پیچھے جو کانسٹیبل آرہے تھے، وہ اے۔ ایس۔ آئی سے بھی پیچھے چلے گئے۔

میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ بدرُوحوں سے کبھی سامنا نہیں ہُوا تھا۔ مندر اتنا ڈراؤنا تھا کہ وہاں بدرُوحوں کی موجودگی کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا، مگر میری ذمّہ داری کچھ اور تھی۔ میں نے ایک آیت دل میں پڑھی جو مجھے یاد نہیں رہی کہ کیا تھی، اور میں ٹارچ روشن کرکے آگے چلا گیا۔ صحن میں آٹھ دس گز چوڑا ایک حوض یا تالاب تھا جس کے کنارے پتھروں سے پختہ کئے گئے تھے جیسے بعض مسجدوں میں وضو کے لئے تالاب بنائے ہُوتے ہوتے ہیں۔ اس میں معلوم نہیں کتنا پُرانا پانی تھا۔ پانی کی سطح پر سبز کائی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرا ٹارچ والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

میں صحن میں گیا تو ٹارچ کی روشنی میں مجھے تالاب کے کنارے پر ایک عورت بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ اُس کی گود میں دُودھ پینے کی عمر کا بچّہ تھا۔

میں قریب گیا تو دیکھا کہ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں جوں جوں قریب ہوتا جا رہا تھا، اُس کے چہرے پر خوف کے آثار پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ میں اُس سے تین چار قدم دُور رُک گیا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ مجھ سے ڈر رہی ہے یا مجھے اُس سے ڈرنا چاہیئے۔

اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ بدرُوح ہوتی تو اب تک غائب ہو چکی ہوتی یا مجھ پہ وار کر چکی ہوتی۔ اتنے میں وہ آہستہ آہستہ اُٹھنے لگی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھاگنا چاہتی ہے۔

میں نے پیار کے لہجے میں پوچھا ــــ "کون ہو تم؟ .... ڈرو مت۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ بیٹھی رہو۔"

"نہیں" ــــ اُس نے سخت گھبرائے لہجے میں کہا ــــ "تم میری مدد نہیں کرو گے۔ مجھ پہ رحم کرو.... تم کون ہو؟ مجھے پہچانتے ہو؟"

"یہ تو سُندری ہے؟" ــــ میرے عقب سے آواز آئی۔ یہ سُندری کے گاؤں کا آدمی تھا۔ اسے میں نے ایک اور آدمی کے ساتھ مندر کے باہر کہیں چھپے رہنے اور مندر پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کیا تھا۔

"تمہارا نام سُندری ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

اُس نے ہاں میں سر ہلایا تو میں نے کہا ــــ "میں تھانیدار ہوں۔ گھبراؤ نہیں بیٹھ جاؤ۔ کسی سے نہ ڈرو۔"

"آپ مجھے پکڑ کر تھانے لے جائیں گے؟" ــــ اُس نے ایسی آواز میں پوچھا جیسے کنوئیں میں بول رہی ہو۔ اُس کی آواز بہت سُریلی تھی۔

"میں تمہیں تھانے ضرور لے جاؤں گا لیکن تمہیں پکڑوں گا نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"مجھے میرے خاوند اور اُس کے باپ سے بچا سکتے ہو؟" ــــ اُس نے پوچھا۔

"تم میری حفاظت میں ہو سُندری!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں

انہیں ایسا ڈراؤں گا کہ تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔"

"وہ بڑا ظالم آدمی ہے" ــــ اُس نے ڈری سہمی ہوئی چھوٹی سی بچی کی طرح کہا ــــ "آپ میرے خاوند کو نہیں جانتے۔"

میں نے اُسے بہت تسلیاں دیں اور اپنی شفقت کا اظہار ایسے انداز سے کیا کہ وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے اُسے اپنے گھوڑے پہ بٹھایا اور بچہ جس کی عمر تین چار ماہ تھی، اُس کی گود میں دے دیا۔ میں نے گھوڑے کی باگ پکڑی اور پیدل چل پڑا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے اپنا گھوڑا پیش کیا لیکن میں نے سُندری پر اثر ڈالنے کے لئے پیدل چلنا بہتر سمجھا۔ اے۔ ایس۔ آئی کے کان میں کہا کہ وہ سُندری کے گاؤں سے اُس کے خاوند، سُسر اور نمبردار وغیرہ کو تھانے لے چلے۔

گویا ڈکیت جسے کوئی نہ پکڑ سکا

تھانے لے جا کر سُندری کو پانی پلایا۔ اپنے گھر سے پراٹھے پکوائے جو خالص گھی کے تھے۔ اُس کے لئے دُودھ منگوایا۔ وہ بہت بھوکی تھی۔ اُس کا بچہ سویا ہُوا تھا۔ وہ کھاتی پیتی رہی اور میں اُس کے دل سے خوف اور گھبراہٹ نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس وقت اُسے پناہ اور شفقت کی ضرورت تھی جو میں نے دے دی۔ اُس کے چہرے پر اطمینان اور سکون کا تاثر آ گیا۔

"اب میرا کیا بنے گا؟" ــــ اُس نے آہ بھر کر کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا" ــــ میں نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو اور دیکھو کہ میں تمہاری مشکل کس طرح آسان کرتا ہوں۔"

مجھے اپنے کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لئے سُندری کی شناخت کرانی تھی۔ میں نے اُس کے سُسر اور خاوند کو اندر بلایا۔ اُس کے خاوند

نے اُسے میرے دفتر میں بیٹھے دیکھا تو اس طرح اُس پہ لپکا جس طرح بھیڑیا خرگوش پر جھپٹتا ہے۔ اُس نے بڑی غلیظ گالی دے کر کہا ــــ "آ گئی اپنے یاروں سے مل کر؟"

میں قریب ہی کھڑا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ سُندری تک پہنچتا، میں نے اُس کے مُنہ پر بڑی زور سے اُلٹا ہاتھ مارا۔ وہ چونک کر رُکا۔ میں نے اُس کے مُنہ پر سیدھے ہاتھ کا تھپڑ جمایا تو وہ چکّر کھا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے اُسے وہ گالی دی جو اس تقریب کے لئے موزوں تھی اور کہا ــــ "تم اتنے جوانمرد ہوتے تو یہ گھر سے بھاگ نہ جاتی۔ دُور کھڑے رہو اور مجھے صرف یہ بتاؤ کہ یہی ہے تمہاری بیوی؟"

"یہی ہے" ــــ اُس نے کہا۔

"اور تم کیا کہتے ہو؟" ــــ میں نے سُندری کے سُسر سے پُوچھا ــــ "یہی ہے تمہاری بہو جس کی تم نے رپورٹ لکھوائی تھی کہ گم ہو گئی ہے؟"

اُس نے اپنے بیٹے کے ساتھ میرا سلوک دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے اور بھکاریوں کی طرح بولا ــــ "ہاں مہاراج! یہی ہے .... اور مہاراج! یہ ہماری رقم اور زیور ساتھ لے گئی تھی۔"

"بکو مت" ــــ میں نے کہا ــــ "اور باہر برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔"

پھر میں نے نمبردار، سفید پوش وغیرہ سے سُندری کی شناخت کرائی۔ سب کو باہر بیٹھنے کو کہا اور میں سُندری کی طرف متوجہ ہُوا۔

"دیکھو سُندری!" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نے دیکھ لیا ہے میں نے تمہارے خاوند کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اب مجھے سب کچھ بتا دو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم کہاں چلی گئی تھیں۔"

"گوپے کے پاس" ــــ اُس نے کہا۔

"گوپے ڈکیت کے پاس؟" ــــ میں نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے لئے ڈکیت ہو گا" ــــ اُس نے کہا ــــ "میرے لئے نہیں۔ میں اُسے ڈکیت سمجھتی تو اُس کے ساتھ جاتی کیوں؟"

"پھر آ کیوں گئی ہو؟"

"وہ قتل ہو گیا ہے" ــــ اُس نے کہا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

میں اور زیادہ حیران ہُوا کہ گوپا ڈکیت قتل ہو گیا ہے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ گوپا کون تھا۔ اُس کا نام گوپال چند تھا۔ پولیس کے کاغذات میں گوپال چند عرف گوپا لکھا جاتا تھا۔ وہ میرے ساتھ والے تھانے کے علاقے کا مشہور جرائم پیشہ تھا۔ قتل کی تین اور تین چار ڈکیتی کی وارداتوں میں مطلوب تھا۔ ان میں سے ایک واردات میرے تھانے کی تھی۔ پکڑا نہیں جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ علاقہ چٹانی اور جنگلاتی تھا۔ تعاقب اکثر ناکام رہتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ دیہات کے لوگ اس کی مدد کرتے تھے کیونکہ وہ ان لوگوں کی مدد کرتا تھا۔ لوگ اُس سے ڈرتے بھی تھے اس لئے اُس کی نشاندہی نہیں کرتے تھے۔ وہ ہندو ساہوکاروں کو لُوٹتا تھا۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ کسی کی بہو بیٹی کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ اُس نے ایک مسلمان جاگیردار کو اس لئے قتل کر دیا تھا کہ اُس نے ایک غریب کسان کی کنواری بیٹی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔

میں نے اُس کی صرف تصویر دیکھی تھی جو تھانے کے ریکارڈ میں تھی۔ پُرکشش شکل وصورت اور توانا جسم کا آدمی تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے اُوپر ہو گئی تھی۔ دو مرتبہ مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ فلاں جگہ ٹھہرا ہُوا ہے۔ میں نے چھاپہ مارا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔ دونوں مرتبہ ایسے ہی ہُوا۔

اب سُندری نے بتایا کہ وہ قتل ہو گیا ہے تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ میں نے سُندری سے پوچھا کہ اُسے قتل کرنے کی جرأت کس نے کی ہے؟ اُس نے بتایا کہ اُس کی ایک داشتہ نے جس کا نام اُس نے جھیما بتایا، اُسے اُسی کے پستول سے قتل کیا ہے۔

"کیا پولیس کو پتہ چل چکا ہے کہ گوپا قتل ہو گیا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں" ــــ سُندری نے جواب دیا ــــ "میں اُسی روز

وہاں سے آگئی تھی۔ یہ کل رات کی بات ہے۔"

بیوی پیار کی پیاسی، خاوند بچے کا خواہشمند

میں نے سُندری سے کہا کہ وہ پوری بات سُنائے کہ وہ کیوں اور کس طرح گھر سے نکلی اور واپس مندر میں کیوں آکر بیٹھ گئی تھی۔ اُس نے اپنی جو بپتا سُنائی وہ میں اپنے الفاظ میں سناتا ہوں:

اُس کے خاوند کے متعلق جو کچھ بتایا جا چکا ہے، اُس کی سُندری نے تصدیق کر دی۔ وہ خاوند کی باندی بنی رہنا چاہتی تھی لیکن خاوند کے وحشی پن نے اُس کے لئے جینا حرام کر دیا۔ اس گھر میں صرف ساس تھی جس سے اُسے پیار ملتا تھا۔ سُندری نے بیان دیتے ہوئے کئی بار کہا کہ ماں باپ نے اُسے لاڈ اور پیار سے پالا تھا۔ وہ پیار کی زبان ہی سمجھتی تھی مگر خاوند بڑا ظالم نکلا۔ شادی کا ایک سال گزرا تو خاوند نے اُسے اس الزام میں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ اُس میں ابھی بچہ پیدا کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

ایک روز سُندری نے خاوند سے کہہ دیا کہ بچہ پیدا کرنا صرف عورت کا کام نہیں ہوتا۔ اِس پر خاوند نے اُس کی خوب پٹائی کی اور کہا کہ تُو عورت ذات ہو کر خاوند کے مُنہ آتی ہے۔ سُندری کے دل میں خاوند کی نفرت پیدا ہونے لگی لیکن اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ خاوند سے بے وفائی کرے گی۔ وہ بڑی شوخ اور چنچل ہُوا کرتی تھی مگر اُس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اپنے خاوند کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُس پر اپنی مردانگی کا رعب ڈالنے کے لئے اپنی بہادری کی ڈھینگیں مارتا رہتا اور قتل سے نیچے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ کسی کے بھی خلاف بات کرے تو یہ ضرور کہتا تھا کہ میں اُسے قتل کر دوں گا۔

سُندری کی اب یہی خواہش رہ گئی تھی کہ اُسے بچہ پیدا ہو یا نہ ہو،

اُسے کھانے اور پہننے کو ملے یا نہ ملے، اُسے خاوند کا پیار مل جائے۔ اُس نے کئی بار خاوند سے پیار کی التجا کی لیکن اسے ڈانٹ ڈپٹ ملی۔ دن گزرتے گئے۔ سُندری نے اپنا من مار لینے کی بہت کوشش کی لیکن جذباتی لحاظ سے مُردہ نہ ہو سکی۔ وہ اپنی ماں کے سامنے اور اپنی سہیلیوں کے سامنے اپنا رونا روتی تھی۔ ماں نے اُسے کچھ ٹونے ٹوٹکے بتائے۔ سب ناکام ہو گئے۔ کسی نے ایک ٹونہ یہ بتایا کہ کسی کا دُودھ پیتا بچہ مر جائے تو بچے کی لاش پر لڑکرا اُلٹا رکھے اور لڑکرے پر بیٹھ کر نہائے مگر یہ ناممکن تھا۔ ایک سنیاسی نے یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کے قبرستان میں سے کسی بچے کی قبر سے کھوپڑی نکالے اور آدھی رات کے وقت ندی پر جا کر اِس طرح نہائے کہ اس کھوپڑی میں پانی ڈال کر اپنے اُوپر پھینکے، پھر کھوپڑی کو ندی میں پھینک دے۔ یہ بھی سُندری کے لئے ممکن نہ تھا۔

اڑھائی تین سال گزر گئے۔ یہ مشہور ہو گیا کہ پُرانے مندر میں ایک تارک الدّنیا پنڈت آیا ہے جو دوائیوں سے ہر مرض کا علاج کرتا ہے اور مرادیں بھی پوری کرتا ہے۔ سُندری کی ساس نے سُندری سے کہا کہ سُنا ہے یہ پنڈت بے اولاد عورتوں کو اولاد بھی دیتا ہے اور وہ پُرانے مندر میں جائے۔ سُندری وہاں جانے سے گھبراتی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ پُرانے مندر کے متعلق اُس نے بڑی ڈراؤنی باتیں سُن رکھی تھیں اور دوسرے اس لئے کہ اُسے پتہ چلا تھا کہ اولاد کی خواہشمند عورتیں پنڈتوں کی بے نکاحی بیویاں بن جاتی ہیں۔ سُندری اپنی عزّت قربان کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔

لڑکی پر جادُو چل گیا

خاوند کے ظلم و تشدد سے تنگ آکر اور اپنی ساس کے بار بار کہنے

پر اُس نے پرانے مندر میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ اپنی تین سہیلیوں کے ساتھ ندی پر نہانے جایا کرتی تھی۔ ایک صبح اُس نے ہمت کی اور سہیلیوں کے ساتھ ڈرتی جھجکتی مندر میں چلی گئی۔ اتفاق سے پنڈت اسے ڈیوڑھی میں ہی مل گیا۔ اس کے ساتھ اُس کا ایک چیلہ بھی تھا۔ چیلے نے اُسے بتایا کہ یہ پنڈت مہاراج ہیں، اِن کے پاؤں چھوؤ۔ سُندری اور اُس کی سہیلیوں نے پنڈت کے پاؤں چھوئے۔ پنڈت انہیں اُس کمرے میں لے گیا جہاں اُس نے مورتیاں اور بُت رکھ کر عبادت گاہ بنا رکھی تھی۔ پنڈت نے لڑکیوں سے عبادت کرائی۔

سُندری نے پنڈت سے کہا کہ شادی کئے تین سال ہونے کو ہیں، بچّہ پیدا نہیں ہوتا۔ پنڈت نے اسے کہا کہ وہ مندر میں آتی رہے اور جیسا وہ کہے ویسا کرتی رہے، پھر کبھی اشارہ ملے گا کہ بچّہ کب ہوگا یا ہوگا ہی نہیں۔ پنڈت نے کچھ بڑبڑا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور اُسے یقین دلایا کہ بچّہ پیدا ہوگا۔ مختصر یہ کہ پنڈت نے ایسی باتیں اور ایسی اداکاری کی کہ سُندری پہ اُس کا جادو چل گیا۔ پنڈت نے اس پہ تاثر پیدا کیا کہ وہ واقعی تارک الدّنیا ہے اور اُس کے دل میں کوئی دنیاوی لالچ نہیں۔

سُندری دوسرے تیسرے دن مندر میں جانے لگی۔ پنڈت نے اُس پر ایسی شفقت کی کہ وہ پنڈت کے ساتھ دل کی باتیں بھی کرنے لگی۔ اُس نے پنڈت سے کہا کہ اُسے بچّے کی اتنی خواہش نہیں جتنی پیار کی ہے۔ اُس کے لئے پیار کی بجائے دھتکار رہ گئی ہے۔ پنڈت نے اُسے کہا پیار بھی مل جائے گا اور بچّہ بھی۔ ہندو توہم پرست ہوتے ہیں۔ پنڈت نے سُندری کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا اور ایک روز اُسے سہیلیوں سے الگ کر کے کہا کہ اُس نے جنم پتری نکالی ہے۔ اس سے اُسے پتہ چلا ہے کہ اُس کے نام کوئی اور خاوند لکھا ہُوا تھا۔ اگر سُندری کے ماں باپ کسی پنڈت سے پوچھ کر اُس کی شادی کرتے تو

وہ انہیں بتا دیتا کہ اُس کی شادی اس آدمی کے ساتھ نہ کی جائے کیونکہ دونوں کے ستاروں کے راستے ایک دوسرے کی اُلٹ سمت کو جاتے ہیں۔

سُندری کے لئے یہ اطلاع بہت بُری تھی۔ اُس نے علاج پوچھا۔ اپنی بدنصیبی کا توڑ پوچھا۔ پنڈت نے اُسے بتایا کہ ستاروں کے راستے نہیں بدلے جا سکتے۔ اگر وہ اسی خاوند کے پاس رہی تو اُس کی زندگی روز بروز تلخ ہوتی جائے گی۔ تاہم پنڈت نے کوشش کا وعدہ کیا۔ مختصر یہ کہ سُندری پوری طرح پنڈت کی باتوں میں آگئی —— اور ایک صبح پنڈت اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا جس کے سر، چہرے اور کندھوں پر سیاہ کپڑا پڑا ہُوا تھا۔ اُس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ پنڈت نے سُندری سے کہا —— ”دِل سے خوف نکال دو۔ ستاروں کا چکر ہے۔ تمہارا ستارہ صحیح ستارے کے پاس آگیا ہے۔ انسان بڑی بے بس چیز ہے۔ اپنے ہاتھوں برباد ہوتا ہے۔ میں نے ستارے ملا دیئے ہیں۔ دل کو مضبوط کرو۔ ڈرو مت، دیوی نے جو مجھے دکھایا ہے وہ میں نے تیرے آگے کر دیا ہے۔“

اِس دوران نقاب پوش نے نقاب اُتار دیا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ ایسا چہرہ تھا جو سُندری کو بہت اچھا لگا۔ پنڈت کمرے سے نکل گیا۔ سُندری ڈر سی گئی۔ نقاب پوش نے اُسے کہا کہ مجھ سے ڈرو نہیں۔ جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ مجھے کہو گی چلے جاؤ تو میں چلا جاؤں گا۔ مجھے تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ دل میں تمہارا پیار لے کر آیا ہوں تم کانٹوں میں پڑی ہوئی ہو۔ کہو تو اُٹھا کر پھولوں کی سیج پر رکھ دوں۔ نہیں تو میں بھی کانٹوں میں پڑا رہوں گا۔

سُندری نے مجھے بتایا کہ وہ کسی کے مُنہ سے پیار کے دو بول سُننے کو ترس گئی تھی۔ پنڈت کی باتوں کا بھی اثر تھا۔ اُسے اس آدمی کی باتیں اتنی اچھی لگیں کہ وہ اُسے اچھا لگنے لگا۔ اُس نے بُری نیّت کا اظہار نہ کیا۔

سُندری نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ نقاب پوش نے کہا کہ وہ محبت کا پیاسا ہے اُسے جسم نہیں رُوح چاہیئے اور اس رُوح میں پیار ہو۔ سُندری نے اُسے کہا کہ وہ اپنے جسم سے تنگ آچکی ہے اور اسے اپنے اور اپنے خاوند کے جسم سے نفرت ہوگئی ہے۔ نقاب پوش کا جادو چل گیا۔ اُس نے کہا کہ وہ زیادہ دیر رُک نہیں سکتا، پھر کبھی آئے گا اور جب آئے گا، پنڈت سُندری کو بتا دے گا۔

وہ جب چلا گیا تو سُندری کو یُوں افسوس ہُوا جیسے اُسے بچّہ مل گیا تھا اور وہ مر گیا ہے۔ اُس نے اپنی سہیلیوں سے ذکر نہ کیا۔۔۔ اس کے بعد یہ نقاب پوش تیسرے چوتھے روز اُسے ملتا رہا۔ وہ ندی سے جلدی فارغ ہو کر مندر میں چلی جاتی۔ نقاب پوش اُس کے ساتھ پیار کی ترسی ہوئی باتیں کرتا۔ سُندری نے اُسے اپنے خاوند کی باتیں بتا دیں۔ نقاب پوش نے اُس کے ساتھ ابھی تک کوئی بیہودہ بات نہیں کی تھی۔ سُندری اُسے سچّے پیار کا پیاسا سمجھتی تھی۔

ایک روز سُندری اُس کی گود میں گر پڑی جیسے اُسے خاوند کے ظلم و تشدّد اور وحشی پن سے پناہ مل گئی ہو۔ ظالم اور کھردرے جسموں والے خاوندوں کی بیویاں ایسی ہی پناہیں ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ بعض ہمت کر کے پناہ ڈھونڈ لیتی ہیں اور بعض چار دیواری کے قید خانے میں بند کڑھتی رہتی ہیں۔ سُندری نو عمر لڑکی تھی۔ مظلوم اور مجبور تھی۔ ترسی ہوئی تھی۔ اُس نے نقاب پوش کی گود میں گر کر اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا — اور اس ملاقات کی یادگار یہ تین چار ماہ کا بچّہ تھا جو میرے دفتر میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔

بہن کی عزّت نے ڈاکو بنا دیا

میں نے گوپلے ڈکیت کا فوٹو کاغذات میں سے نکال کر سُندری کے

آگے رکھ دیا اور پوچھا — "یہی ہے تمہارے بچّے کا باپ؟"

اُس نے پھٹی پھٹی نظروں سے گوپلے کی تصویر دیکھی، پھر حیرت سے کھُلی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس کا سر جھک گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور بھیک مانگنے کے لہجے میں بولی — "یہ تصویر آپ کیا کریں گے؟ مجھے دے دیں۔ اُس نے مجھے بتا دیا تھا کہ میری تصویر تھانے میں موجود ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ پولیس کی رائفلیں اور پستول مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ مجھے مرنا ہے۔ پولیس کی گولی سے یا پھانسی کے تختے پر۔۔۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں مر گیا تو تمہیں میری لاش نہیں ملے گی۔ کسی تھانیدار کے پاس چلی جانا اور میری تصویر کی بھیک مانگنا۔ کوئی تھانیدار دل والا ہُوا تو تمہیں تصویر دے دے گا۔"

"میں تمہیں تصویر دے دوں گا" — میں نے جھوٹا وعدہ کیا۔ میں اُسے یہ تصویر نہیں دے سکتا تھا۔ یہ سرکاری ریکارڈ کی تصویر تھی۔ یہ لڑکی اب کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کی قسمت اور مستقبل پر سیاہ کالی مُہر لگ چکی تھی۔ اُس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا۔ اُسے جیل میں جانا تھا۔ اس کے بعد اُس کا ٹھکانہ کسی عصمت فروش کا کوٹھا تھا یا کوئی آشرم۔

سُندری بہت دیر تصویر کو دیکھتی رہی پھر اُس نے بتایا کہ اپنے خاوند سے اُسے اتنی زیادہ نفرت ہوگئی کہ اُس کی صورت دیکھ کر متلی آنے لگتی تھی۔ سُندری نے اُسے جب بتایا کہ اُسے کچھ ہونے والا ہے تو وہ اور زیادہ شیر ہوگیا۔ ہونے والے بچّے کو وہ اپنا بچّہ سمجھتا تھا۔ اس سے سُندری اُس سے اور زیادہ متنفّر ہوگئی۔ خاوند نے خوشی کا اظہار کرنے کی بجائے سُندری پر ڈانٹ ڈپٹ اور زیادہ کر دی۔

ایک صبح گوپا مندر میں آیا ہُوا تھا۔ سُندری اُس روز بہت پریشان تھی۔ اُسے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ گوپا ڈاکو اور مفرور قاتل ہے۔ اُس نے سُندری کو اپنا نام کچھ اور بتایا تھا۔ اُس صبح سُندری نے اُسے

کہا کہ اب وہ اس خاوند کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ اُس نے گوپے سے کہا ــــ "تم اب میرے ہونے والے بچے کے باپ بن چکے ہو۔ میں خاوند کو مزید دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ اس کی مار پٹائی بھی برداشت نہیں کر سکتی، اور اب تو اُس کے جسم سے مجھے بدبو محسوس ہوتی ہے۔"

گوپے نے پہلی بار اُسے بتایا کہ وہ مفرور قاتل اور پیشہ ور ڈاکو ہے اور پولیس اُسے ڈھونڈ رہی ہے اور وہ موت کے سائے میں جی رہا ہے ــــ "میں یہاں نقاب اوڑھ کر آتا ہوں" ــــ گوپے نے اُسے کہا ــــ "گھوڑی ایک جگہ چھپا آتا ہوں۔ اس مندر میں ایک روز ذرا ستانے رُک گیا تھا۔ پنڈت سے گپ شپ ہوتی تو پتہ چلا کہ یہ مذہب کا شیدائی نہیں، شکاری اور نوسر باز ہے۔ اس کے ساتھ میری دوستی ہو گئی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں کون ہوں۔ اِسے میں نے کچھ رقم دی اور یہ بھی کہا کہ یہ مندر میرے چھپنے کے لئے اور مال چھپانے کے لئے نہایت اچھا ہے۔ اگر پنڈت نے مجھے کبھی دھوکہ دیا تو زندہ نہیں رہے گا .... یوں سمجھ لو کہ پنڈت میرا ساتھی بن گیا ہے ....

"اگر میں شریف آدمی ہوتا تو تمہیں خود کہتا کہ اس خاوند کو پھینکو مرگھٹ میں اور چلو میرے ساتھ، لیکن سُندری! میں تمہیں ایک قاتل اور ڈاکو کی بیوی نہیں بننے دوں گا۔ میرے لئے عورتوں کی اور تم جیسی جوان اور خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں۔ مجھے روپے پیسے کا بھی لالچ نہیں۔ مجھے سچے پیار کی ضرورت ہے۔ میں نے پہلے روز تمہیں دیکھا تو تمہیں ایک خوبصورت شکار سمجھا لیکن تم سے باتیں ہوئیں تو میرے دل نے کہا کہ یہ لڑکی جسم نہیں رُوح ہے جسے تم ڈھونڈ رہے ہو۔ میں جسموں سے کھیلتا رہا ہوں۔ سُندری! میری رُوح پیاسی رہی ہے۔ تم نے یہ پیاس بجھا دی اور میں نے محسوس کیا کہ میں تو بہت کمزور آدمی ہوں۔ تم سے پہلے مجھے عورتیں ملتی رہی ہیں، تمہارے وجود میں مجھے

پیار ملا ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ میں قاتل ہوں، ڈاکو اور رہزن ہوں۔ میں تمہیں ذلیل و خوار کرنے کے لئے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

سُندری نے مجھے سنایا کہ اُس کے مُنہ سے یہ اعتراف سُن کر کہ وہ ڈاکو اور قاتل ہے، سُندری پر کچھ اثر نہ ہُوا ــــ "میں تو ایسے محسوس کرتی تھی جیسے اُس کے جسم کا حصّہ بن گئی ہوں جو کاٹا نہیں جا سکتا" ــــ مجھے سُندری کے یہ الفاظ آج تک یاد ہیں۔ وہ اُس کے پیچھے پڑی رہی کہ وہ اُسے ساتھ لے چلے۔ سُندری نے اپنی سہیلیوں کو نہ بتایا کہ وہ پنڈت کے کمرے میں کسی اور آدمی سے ملتی ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گوپے نے پنڈت سے کہا تھا کہ وہ اِس لڑکی پر ہاتھ رکھنے کی کبھی جرأت نہ کرے۔

ایک بار گوپے نے سُندری کو بتایا کہ وہ ڈاکو باپ کا بیٹا نہیں، نہ وہ پیدائشی ڈاکو ہے۔ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ اُس کی عمر اُس وقت سولہ سترہ سال تھی۔ اُس سے دو سال چھوٹی ایک بہن تھی۔ وہ بھوپال میں ایک جنگل میں رہتے تھے۔ اُس کا باپ جنگل کے ایک ٹھیکیدار کا ملازم تھا۔ اُس کی ماں بھی جنگل میں عورتوں کے ساتھ کام کرتی تھی۔ وہ خود بھی باپ کے ساتھ روزمرّہ اُجرت پر کام کرنے لگا۔ اُس کی بہن جس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی، خوبصورت لڑکی تھی۔ جنگل کے ٹھیکیدار نے اُسے اپنے ہاں بلایا۔ وہ واپس آئی تو رو رہی تھی۔ ٹھیکیدار نے اُسے بے آبرو کیا تھا۔ گوپے کا خون کھول اُٹھا۔ اُسے مزدوروں نے کہا کہ وہ اِن ٹھیکیداروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر اُسے عزّت کا اتنا ہی خیال ہے تو جنگل سے نکل جائے اور شہر میں کہیں محنت مزدوری کر لے۔

گوپے کی غیرت نے اُسے باؤلا کر دیا اور وہ ٹھیکیدار پر جا حملہ آور ہُوا۔ بھوپال ایک ریاست تھی جہاں نواب کا قانون چلتا تھا۔ گوپے کو پولیس کے حوالے کیا گیا اور دو روز بعد اُسے دو سال سزائے قید دے دی گئی۔ عدالت میں اُس کی یہ دہائی کسی نے نہ سُنی کہ اُس نے اپنی بہن کی بے حُرمتی

کا انتقام لیا ہے۔ جیل میں اُسے پیشہ ور مجرم مل گئے۔ وہ جیل میں روتا اور تڑپتا اور ہر کسی کو سُناتا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا بے انصافی ہوئی ہے۔ اُستاد مجرموں نے اُسے سنبھال لیا اور اُسے انتقام کے اِس راستے پر ڈال دیا۔ وہیں اسے ایک نامی گرامی رہزن ملا جس نے اُسے اپنا شاگرد بنا لیا۔

گوپا جب باہر آیا تو اُس ٹھکانے پر چلا گیا جو اس رہزن نے اُسے بتایا تھا۔ اُس نے دو تین سال رہزنی کی۔ ڈکیتی کی ایک دو وارداتوں میں شریک ہُوا۔ اُسے تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ اُس نے اس علاقے میں آکر وارداتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ صرف ایک بار پکڑا گیا اور اُسے چار سال قید ہوئی۔ اب قید کاٹ کر نکلا تو وہ اور تجربہ کار ہو چکا تھا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ پولیس کے محکمے کے لئے بڑا ہی خطرناک چیلنج بن گیا۔ اُس کی تصویر جیل میں لی گئی تھی کیونکہ وہ پیشہ ور رہزنوں کے گروہ کا آدمی تھا۔ پھر یہ تصویر تمام تھانوں میں بھیج دی گئی تھی۔

گوپے نے سُندری کو بتایا کہ اُس نے اپنی ماں اور بہن کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اُدھر کبھی گیا ہی نہیں لیکن اُن کی محبّت نے اُسے دیوانہ بنائے رکھا اور وہ اس محبّت کے لئے ترستا رہا۔ اُس نے دیہات کے لوگوں کی بہت خدمت کی۔ کئی غریبوں کی بیٹیوں کی شادیاں کرائیں۔ کئی گھروں کے تنازعے اور خاندانوں کی خونی دشمنیاں ختم کیں۔ اُس نے جنگلوں کے ٹھیکیداروں، سُود خور ساہوکاروں اور مزارعوں کے بادشاہوں جیسے جاگیرداروں کو خُوب لُوٹا۔ اُس کا اب اپنا گروہ تھا۔ اُس نے ایک سے ایک خوبصورت داشتہ رکھی، لیکن اُس نے سُندری کو بتایا کہ اُسے وہ پیار کسی سے نہ ملا جس میں ماں اور بہن کا اور وفا شعار بیوی کا خلوص ہوتا ہے۔ یہ پیار اُسے سُندری سے ملا اور سُندری کو پیار اس ڈاکو سے ملا۔

یہ گوپے کے پُرخلوص پیار کا ثبوت تھا کہ وہ سُندری کو اپنے

ساتھ نہیں لے جا رہا تھا۔ اُسے کہتا تھا کہ میرے ساتھ جاؤ گی تو لوگ تمہیں میری داشتہ کہیں گے، اور میں تمہارے ساتھ شادی اس لئے نہیں کرتا کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میں نے اپنے پیشے سے توبہ کر بھی لی تو بھی آزاد زندگی بسر نہیں کر سکوں گا کیونکہ میں مفرور قاتل اور ڈکیت ہوں۔

ننھّے مُنّے بچّے نے پتھر کو موم کر دیا

سُندری کے لئے بڑی ہی تکلیف دہ صورت پیدا ہو گئی۔ خاوند کو اب وہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ گوپا اُسے کبھی تیسرے چوتھے روز اور کبھی پندرہ بیس روز بعد ملنے آتا تھا۔ اُن کی ملاقات آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کیونکہ سُندری کو سورج نکلنے سے بہت پہلے گھر پہنچنا ہوتا تھا اور گوپا بھی مفرور اور مطلوب ہونے کی وجہ سے وہاں زیادہ دیر رُک نہیں سکتا تھا۔ اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ گوپا واقعی سُندری کو دل و جان سے چاہتا تھا، ورنہ وہ اسے پہلی ہی ایک دو ملاقاتوں میں ساتھ لے جاتا اور وہ اپنے آپ کو بار بار صرف آدھے گھنٹے کی ملاقات کے لئے خطرے میں نہ ڈالتا۔

سُندری نے بچّے کو جنم دیا۔ وہ چالیس روز تک مندر میں نہ جا سکی۔ یہ دن پورے کرنے کے بعد ساس کے کہنے پر پُرانے مندر میں گئی اور پنڈت کو مٹھائی اور نقد کی صورت میں نذرانہ پیش کیا۔ سُندری کے خاوند کی گردن اور زیادہ تن گئی کیونکہ وہ بچّے کا باپ بن چکا تھا۔ سُندری نے کئی بار سوچا کہ اُسے بتا دے کہ یہ بچّہ اُس کا نہیں لیکن بتا نہ سکی ورنہ وہ اُسے قتل کر دیتا۔

گوپے سے ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا کہ وہ بچّہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اگلی ملاقات کا دن مقرر ہُوا۔ سُندری ساس کی اجازت سے بچّے کو پُرانے مندر میں لے گئی۔ گوپے نے اپنا بچّہ دیکھا تو اُسے اُٹھا لیا۔ سُندری

نے بتایا کہ بچے کو دیوانہ وار چومتے اُس کے آنسو نکل آتے۔ وہ بچے کو اپنے سے جدا نہیں کر رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ اُس نے جاتے ہوئے سُندری کو کہا کہ وہ اب ہر ملاقات پر بچے کو ساتھ لایا کرے۔ اگلی ملاقات کا دن مقرر ہُوا۔ اب گوپے کی جذباتی حالت اور زیادہ بُری تھی۔ بچے نے اُسے جذباتی بنا دیا تھا۔

ایک روز گوپے نے سُندری سے بے تاب ہو کر کہا کہ وہ بچہ اُسے دے دے یا اُس کے ساتھ چلی چلے۔ وہ اب بچے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ سُندری اپنا بچہ اُس کے حوالے کر دیتی۔ وہ اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ گوپا نے اُسے رات کا وقت بتایا۔ پنڈت ان کے ساتھ پوری وفاداری کر تا رہا۔ ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصے تک اُس نے اپنے ساتھیوں کو بھی پتہ نہ چلنے دیا کہ یہاں ایک نامی گرامی ڈاکو آتا ہے جسے پکڑوا دیا جاتے تو انعام ملے گا۔ اب گوپے نے اُسے بتایا کہ وہ فلاں رات سُندری کو لے جانے آئے گا۔ پنڈت نے سُندری کو بتایا کہ وہ کس راستے سے مندر میں آئے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ جس رات سُندری کو گھر سے نکلنا تھا اُس رات اُس کا خاوند گھر سے غیر حاضر تھا۔ سُندری نے اپنی چارپائی صحن میں بچھائی۔ آدھی رات کو جب سب گہری نیند سوتے ہُوتے تھے، سُندری اُٹھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ٹرنکوں کی چابیاں کہاں پڑی ہیں۔ اُس نے چابیاں اُٹھائیں۔ ایک ٹرنک سے اپنا اور اپنی ساس کا زیور سمیٹا، دوسرے ٹرنک سے دو ہزار روپے کی تھیلی اُٹھائی، باہر آ کر بچے کو اُٹھایا اور نکل گئی۔

گوپا مندر میں آ چکا تھا۔ سُندری نے اُسے رقم کی تھیلی اور زیور کی پوٹلی دی تو اُس نے غصے سے کہا کہ یہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ ساتھ لانا؟ مجھے تمہاری اور تمہارے بچے کی ضرورت تھی۔ سُندری نے کہا کہ میں کسی اور طریقے سے اپنے خاوند سے انتقام نہیں لے سکتی تھی۔ میں یہ مال انتقاماً لائی ہُوں۔ گوپے نے کہا کہ انتقام لینا تھا تو یہ میرا کام تھا۔ میں اپنے

طریقے سے جاتا۔ تمہارے سُسرال میں ایک سُوئی بھی چھوڑ کر نہ آتا۔ تم کہتی تو تمہارے خاوند کو قتل بھی کر آتا۔

گوپے نے روپوں کی تھیلی پنڈت کو دے دی اور اُسے کہا کہ یہ اُس کا حق ہے۔ سُندری نے زیور میں سے دو کڑے جو اُس کی ساس کے تھے اور ایک انگوٹھی پنڈت کو دے دی۔ کہنے لگی کہ یہ اس کی طرف سے نذرانہ ہے۔ دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہو کر چلے گئے۔

ڈاکوؤں کی کچھار میں

سُندری نے بیس اکیس میل دُور کے ایک گاؤں کا نام بتایا جہاں گوپا اسے لے گیا۔ یہ جنگل اور چٹانوں میں ایک گاؤں تھا جو دوسرے تھانے کی حدود میں تھا۔ وہ ایک مکان میں چلے گئے جو آباد تھا۔ کمرے میں دو نواری پلنگ تھے۔ گوپا نے سُندری کو سو جانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ اُس کے ساتھ باقاعدہ شادی کرے گا۔ سُندری کو معلوم نہ ہو سکا کہ گوپا کہیں چلا گیا تھا یا دوسرے کمرے میں سو یا تھا۔ وہ دوسرے دن اُس کے کمرے میں آیا۔ سُندری نے اُس سے پوچھا کہ یہاں اُس کے پکڑے جانے کا خطرہ تو نہیں؟ اُس نے بتایا کہ اس گاؤں میں اُس کے اپنے آدمی رہتے ہیں، اور اُس کے اس گروہ کے اس گاؤں پر اتنے احسان ہیں کہ کوئی آدمی اُسے دھوکہ نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ گوپے نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ البتہ اسے یہ کہا کہ کوئی عورت اس سے پوچھے کہ تم کون ہو تو کہنا کہ گوپا ساتھ لایا ہے۔

سُندری یہیں رہنے لگی۔ وہ مکان کے صحن میں بھی جاتی تھی۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جو سُندری کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اُس کے تین چار آدمی بھی مکان کے اندر باہر آتے جاتے تھے۔ سُندری بہت خوش اور مطمئن تھی۔ گوپا کہیں چلا گیا تھا۔ وہ تین دن مسلسل غائب رہا۔ اُس

پر سُندری کو اتنا بھروسہ تھا کہ اُس نے کسی سے بھی نہ پوچھا کہ گوپا کہاں چلا گیا ہے۔ اُس کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔

گوپا آگیا۔ اُس نے سُندری سے پوچھا کہ گھر میں جو عورت ہے اس کے علاوہ کوئی عورت تو نہیں آئی؟ سُندری نے اُسے بتایا کہ کوئی عورت نہیں آئی۔ گوپا نے اسے کہا کہ شاید ایک جوان عورت کسی وقت آجائے۔ اُس کا نام چھیما ہے۔ وہ بڑی غصّے والی عورت ہے۔ اگر آکر واہی تباہی بکے تو خاموش رہنا۔ سُندری نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں آکر واہی تباہی بکے گی؟ گوپے نے اسے بتایا کہ چھیما اُس کے پیچھے اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔ ایک سال سے اس کے ساتھ ہے لیکن اُس نے چھیما کے ساتھ ابھی باقاعدہ شادی نہیں کی۔ چھیما اسے کہتی رہتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کرلے اور گوپا اُسے کہتا رہتا ہے کہ ہم میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں، شادی کی کیا ضرورت ہے۔ سُندری کے بیان کے مطابق گوپا سُندری کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

میں تمھارے پیچھے گھر سے نکلی تھی

اگلی صبح چھیما آگئی۔ سُندری نے بتایا کہ اُس کا قد لمبا اور جسم بہت خوبصورت ہے اور شکل وصورت کی بھی اچھی ہے۔ اس کا رنگ گلابی سا ہے اور آنکھیں شربتی۔ وہ سخت غصّے کی حالت میں تھی۔ گوپا اور سُندری الگ الگ پلنگوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سُندری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ اُس نے کمرے میں آکر سُندری کی طرف اشارہ کیا اور بولی — ”اسے لائے ہو؟ ... یہ مجھ سے زیادہ خوبصورت اور جوان ہے نا! مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی کروگے اور مجھے ٹالتے رہے ہو۔“

”چھیما!“ — گوپے نے اسے کہا — ”میں تمھیں کہہ چکا ہوں کہ شیامے

کے ساتھ شادی کرلو۔ میری جان چھوڑدو۔ جتنی رقم مانگوگی دوں گا۔“

”میں تمھارے پیچھے گھر سے نکلی تھی“ — چھیما نے غصّے سے کہا — ”شیامے کے ساتھ اُس وقت شادی کروں گی جب تم مرجاؤگے۔“

گوپے کو بھی غصّہ آگیا۔ سُندری حیران ہوئی کہ کوئی عورت اس دلیری سے مردوں کی طرح باتیں کرسکتی ہے۔ سُندری کو معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان میں ڈاکو عورتیں بھی ہیں جنہوں نے مردوں کے گروہ بنا رکھے ہیں۔ گوپا غصّے سے بولا تو چھیما اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ گوپے نے اُسے دھتکار دیا تو چھیما گوپے کے سرہانے پہ لپکی۔ سرہانے پر گوپے کا پستول پڑا تھا جو اُس نے ابھی ابھی سرہانے کے نیچے سے نکال کر اوپر رکھا تھا۔

گوپے کو اُس نے اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ اُس نے دو قدم کے فاصلے سے گوپے کے سینے میں یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلادیں۔ گوپا پلنگ پہ لڑھک گیا۔ سُندری کی چیخ نکل گئی۔ چھیما اس کی طرف گھومی۔ گوپا ابھی مرا نہیں تھا۔ اُس نے کہا — ”چھیما! یہ لڑکی بے قصور اور مظلوم ہے۔ یہ بچّہ میرا ہے۔ تم بھی اسی طرح کی عورت ہو۔ اسے نہ مارنا۔“

چھیما نے پستول پرے پھینک دیا۔ گوپے کا پلنگ اُس کے خُون سے لال ہوگیا تھا۔ گوپے کی آنکھیں کھلی رہیں اور وہ مرگیا۔ سُندری کو غشی آرہی تھی۔ گولیوں کی آواز پر تین چار آدمی اور ادھیڑ عمر عورت دوڑی آئی۔ چھیما نے کسی سے کہا — ”شیامے! میں نے اسے ماردیا ہے۔ چاہو تو پولیس کو بلالو۔“

”تم نے بہت بُرا کیا چھیما!“ — شیامے نے کہا — ”چلو جو ہُوا اچھا ہُوا ہے۔“

چھیما نے سُندری سے کہا — ”تم جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ۔ مارنا تمھیں بھی تھا لیکن گوپے کی آخری بات کا پاس کرتی ہوں۔ بچّے کو اٹھاؤ اور ابھی چلو جاؤ۔“

سُندری نے بچہ اُٹھایا اور باہر کو چل پڑی۔ ادھیڑ عمر عورت اُس کے پیچھے آئی اور اس کا گاؤں پوچھ کر گاؤں کے باہر تک اس کے ساتھ گئی اور اسے راستہ سمجھا دیا۔ اُس نے سُندری سے کہا کہ تم درندوں میں کہاں آ گئی تھیں۔ شیاما گوپے کا اپنا ساتھی ہے لیکن دونوں میں دشمنی ہو گئی تھی۔ گوپے کو شیامے نے مروا دیا ہے۔ تم اپنی زبان بند رکھنا۔ کسی کے ساتھ اس گاؤں کی بات کی تو قتل ہو جاؤ گی۔

سُندری تو جیسے ہوش میں نہیں تھی۔ وہ جاتی کہاں؟ اپنے گھر جانے سے ڈرتی تھی، اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دل اور دماغ پر خوف اور ہَول سوار تھا۔ اُس نے کسی کو قتل ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جیسے بے ہوشی میں چلتی رہی ہو۔ شاید راستے سے بھٹک گئی تھی۔ سورج غروب ہو گیا۔ وہ چلتی رہی، رکتی رہی، روتی رہی اور اندھیرے میں مندر تک پہنچ گئی۔ اُسے پنڈت کا خیال آیا۔ وہی اسے پناہ دے سکتا تھا۔ وہ پچھلے دروازے سے مندر میں داخل ہُوئی اور پنڈت کے کمرے تک چلی گئی۔ وہاں اندھیرا تھا۔ وہ رونے لگی اور اس کی آواز بلند ہوتی گئی، پھر بچّہ رونے لگا۔ اس نے بچّے کو دُودھ پلایا اور صحن میں نکل آئی۔

اُس وقت جو دو کانسٹیبل اندر تھے، وہ اسے بدروح سمجھ کر باہر کو بھاگ گئے تھے۔ سُندری کو معلوم نہیں تھا کہ مندر میں پولیس ہو گی۔ اس نے پنڈت کو پکارا مگر وہاں خاموشی تھی۔ وہ حوض کے کنارے بیٹھ گئی، اور میں جا پہنچا۔

مَیں نے اُسی وقت اپنے ساتھ والے تھانے کو فون کیا اور وہاں کے ایس۔ ایچ۔ او سے کہا کہ وہ فلاں گاؤں میں چھاپہ مارے۔ میں نے سُندری کو ساتھ لیا اور لاری سے اُس تھانے پہنچا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ ہم کس قدر تیزی سے اُس گاؤں پہنچے جہاں گذشتہ روز گوپا ڈکیت قتل ہُوا تھا۔ گوپے کی لاش اُسی مکان کے صحن میں دبا دی گئی تھی، وہ برآمد کرائی۔ چھیما اور شیامے اور ان کے تین ساتھیوں کو گرفتار کیا۔ جو زیور سُندری

وہاں چھوڑ آئی تھی وہ بھی برآمد ہو گیا۔ یہ دوسرے تھانے کا کیس تھا۔ میرا کیس سُندری تک محدود تھا۔

پنڈت کا کبھی بھی سراغ نہ مل سکا۔ اُس کے تینوں ساتھیوں کو دھوکہ دہی اور نوسربازی میں چھ چھ ماہ اور سُندری کو چوری میں نو ماہ سزائے قید ہُوئی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اُس نے جو کہانی مجھے سنائی ہے وہ ساری کی ساری عدالت میں سُنائے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ مجسٹریٹ ہندو تھا۔ اُس کے بیان سے متاثر ہو کر اُس نے سُندری کو تھوڑی سزا دی، لیکن اُس کی سزا تو جیل سے نکل کر شروع ہونی تھی۔



بڑھئی کی بیٹی خدا کا خنجر

جُرم وسزا کی یہ کہانی مجھے اپنے ایک دوست سب انسپکٹر چوہدری علی رضا مرحوم نے سنائی تھی۔ میں حسبِ معمول تھانے اور افراد کے صحیح نام ظاہر نہیں کروں گا کیونکہ یہ خاندان آزادی کے بعد پاکستان میں آ گئے تھے۔ کہانی سُنانے کا مقصد یہ نہیں کہ کسی کو رُسوا کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے کے چوہدری اور امام عبرت حاصل کریں اور خُدا کی بے آواز لاٹھی کو ذہن سے نہ اتاریں۔ مجھے سب انسپکٹر چوہدری علی رضا مرحوم کے تھانے کا چارج لینے کے لئے بھیجا گیا۔ یہ چھوٹا سا ایک قصبہ تھا۔ اِرد گرد دکا دیہاتی علاقہ اسی تھانے کے تحت آتا تھا۔ علی رضا نے مجھے چارج دے دیا۔ اُسے اگلی صبح چلے جانا تھا۔ اس تھانے میں اُس کی آخری رات تھی۔

"ملک بھائی!"—— کھانے کے بعد اُس نے کہا —— "میں تمہیں تھانے کا اور علاقے کا چارج دے چکا ہوں۔ ایک چیز رہ گئی ہے۔ یہ ایک کیس تھا جس کا فیصلہ میں نے خود کیا تھا۔ یہ تم بھی سُن لو۔ شاید میرے بعد میرے خلاف کوئی طوفان اُٹھے۔ میرے کئے پر پردہ ڈالنا تمہارا فرض ہو گا۔"

اُس نے جو کیس سُنایا وہ میں اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ میرے چارج لینے سے چھ مہینے پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک مسجد کا امام تھانے میں یہ رپورٹ لے کر آیا کہ اُس کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہے۔ قصبے میں ایک بڑی مسجد

تھی اور دو چھوٹی۔ یہ امام ان دونوں میں سے ایک مسجد کا تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ رنگ گہرا سانولا، قد درمیانہ اور جسم گول مٹول۔ پیٹ بڑھا ہُوا۔ گردن اتنی موٹی جیسے گردن تھی ہی نہیں۔ صحت بہت اچھی تھی۔ داڑھی کے چند ایک بال سفید تھے۔

اُس نے بیوی کی عمر اٹھارہ انیس سال بتائی اور یہ بھی کہ یہ اُس کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی بھی گھر میں موجود تھی۔ اس سے دو بچے تھے۔ دونوں ابھی بہت چھوٹے تھے۔ نئی بیوی (جسے ناصرہ کہہ لیں) کے ساتھ امام نے تین چار مہینے پہلے شادی کی تھی۔ امام نے بیوی کے غائب ہونے کا طریقہ وہی بتایا جو اکثر سُننے میں آتا ہے۔ رات کو لڑکی بستر پر موجود تھی۔ امام صبح اذان دینے کے لئے مسجد کو جانے لگا تو نئی بیوی کو غائب پایا۔ گھر میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ نہ مِلی۔ باہر کے دروازے کی زنجیر اُتری ہوئی تھی۔

نماز پڑھا کر امام ناصرہ کے میکے گھر گیا۔ وہ وہاں نہیں گئی تھی۔ مسجد کا سرپرست ایک چوہدری تھا جس کا کھالوں کا وسیع کاروبار تھا۔ دولت مند آدمی تھا۔ وہ بھی امام کے ساتھ تھانے آیا تھا۔ امام ناصرہ کے میکے گھر سے مایوس لوٹا تو اس چوہدری کے ہاں گیا اور اسے بتایا کہ اس کی نئی بیوی کہیں غائب ہوگئی ہے۔ چوہدری نے دو اور معززین سے بات کی۔ اُنھوں نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیا جاتے۔ نادان لڑکی ہے۔ شاید خود ہی واپس آجاتے۔

کچھ تلاش اور کچھ انتظار میں تین دن گزر گئے۔ گمشدگی کے چوتھے روز تھانے میں رپورٹ آئی۔ چوہدری نے کئی بار کہا کہ لڑکی کو اُس کے باپ نے غائب کیا ہے۔ علی رضا نے وجہ پوچھی کہ باپ نے اپنی بیٹی کو اُس کے گھر سے کیوں غائب کیا ہے؟ —— امام اور چوہدری کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ اُنھوں نے جو جواب دیئے، ان سے علی رضا کو شک ہُوا کہ امام کی بیوی گھر سے بھاگی ضرور ہے لیکن اس میں

امام اور چوہدری کی بھی کوئی کارستانی شامل ہے۔ اگر ان کی بدمعاشی نہیں تو یہ دونوں لڑکی کے باپ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں۔

علی رضا نے چوہدری کو دفتر سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ چونکہ بیوی امام کی تھی اس لئے وہ اس سے تنہائی میں کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ چوہدری باہر جا بیٹھا تو علی رضا نے امام کو غور سے دیکھا۔ میں آپ کو اس کی شکل وصورت، جسامت اور رنگ روغن بتا چکا ہوں۔ علی رضا نے سوچا کہ اس شخص کو کوئی اس جیسی عورت ہی پسند کرسکتی ہے۔ اس نے چالیس سال کی عمر میں اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کے ساتھ شادی کرلی۔ علی رضا نے اُس سے اس کی مغرور بیوی کا حُلیہ پوچھا۔ اُس نے عمر بتا کر جو حُلیہ بیان کیا، وہ کسی خوبصورت لڑکی کا تھا۔ رنگ گورا بتایا گیا۔ یعنی لڑکی نوجوان بھی تھی، خوبصورت بھی۔ ظاہر تھا کہ اس امام کے ساتھ اُس کی شادی زبردستی کی گئی ہوگی۔ اور اُس کے بھاگنے کی یہی وجہ ہوگی۔

وہ شوقین مزاج نہیں تھی

علی رضا نے امام سے پوچھا کہ اُس کی بیوی کا چال چلن کیسا تھا اور کیا وہ کسی کو چاہتی تھی؟ —— کوئی بھی مرد تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کی بیوی اُسے نہیں چاہتی تھی اور اُس کا چال چلن مشکوک تھا۔ امام نے بھی کہا کہ وہ ایسی ویسی نہیں تھی۔

"کیا وہ آپ کو پسند کرتی تھی؟"

امام نے ہچکچا کر جواب دیا —— "کسی کے دل میں جو کچھ ہو وہ کون بتا سکتا ہے۔ مجھ سے اُسے کوئی شکایت نہیں تھی۔"

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو بیوی واپس مل جائے تو جو کچھ آپ کو معلوم ہے اور جو شکوک آپ کے دل میں ہیں، وہ میرے آگے رکھ دیں" —— علی رضا نے اُسے کہا —— "آپ کو کسی کے خلاف ضرور شک ہوگا کہ وہ

آپ کی بیوی کو ورغلا کر لے گیا ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"مجھے کسی کے خلاف کوئی شک نہیں"— امام نے جواب دیا۔

"وہ کچھ لے گئی ہے؟"

"سارا زیور لے گئی ہے"— اُس نے جواب دیا— "اور ٹرنک میں سات سو روپیہ پڑا تھا، وہ بھی لے گئی ہے۔"

جب علی رضا نے اُس سے پوچھا کہ وہ چوہدری اور دوسرے دو آدمیوں کے ساتھ مل کر ناصرہ کو کہاں کہاں ڈھونڈتے رہے ہیں تو امام کوئی ایسا جواب نہ دے سکا جسے صحیح سمجھا جاتا۔ وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔ آخر تان ناصرہ کے باپ پر لوٹی۔

"وہ زیور اور روپیہ اپنے گھر لے گئی ہے"— اُس نے کہا— "مجھے شک ہے کہ اُسے اُس کے ماں باپ نے چھپا لیا ہے۔"

"وجہ؟"— علی رضا نے پوچھا— "کیا اُن کی لڑکی کے ساتھ آپ نے زبردستی شادی کی تھی یا انہیں دھوکا دیا تھا یا لڑکی کے والدین پر آپ نے کوئی ناروا دباؤ ڈالا تھا؟"

امام گھبرا گیا۔ اُس کے جواب سے ظاہر ہوتا تھا (یا وہ یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا) کہ ناصرہ کے والدین نے اُسے برضا و رغبت رشتہ دیا تھا اور ناصرہ بھی خوش تھی۔

"مولوی صاحب!"— علی رضا نے اُسے کہا— "آپ نے لڑکی پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ سارا زیور اور سات سو روپیہ بھی لے گئی ہے، اور آپ نے اُس کے والدین پر یہ الزام لگایا ہے کہ اُنہوں نے لڑکی کو چھپا لیا ہے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی کے والدین نے زیور اور روپیہ اُڑانے کے لئے اُسے آپ کے گھر سے بھگایا اور اُسے چھپا لیا ہے؟ ... میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ اُنہوں نے اگر ایسا کیا ہے تو یہ ایک سنگین جُرم ہے اور میرا فرض ہے کہ میں آپ کی بیوی اور آپ کا مال برآمد کراؤں، اُس کے والدین کو جیل بھجواؤں، لیکن آپ یہ سوچ لیں

کہ میں نے پرچہ کر دیا اور تفتیش میں بات کچھ اور نکلی اور آپ کا الزام غلط ثابت ہُوا تو اُن کی جگہ آپ کو جیل جانا پڑے گا۔ رپورٹ لکھوانے سے پہلے سوچ لیں کہ رپورٹ جھوٹی نہ ہو۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ علی رضا نے اُسے سوچنے کا پورا موقع دیا۔ امام نے بے جان سی آواز میں کہا— "زیور اور رقم تو چوری ہُوئی ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔"

ان کے درمیان بہت باتیں ہُوئیں۔ امام ڈانواں ڈول سا ہو گیا۔ علی رضا کے سوالوں کا جواب دیتے ہُوئے امام نے بتایا کہ ناصرہ شادی سے پہلے پردہ نہیں کرتی تھی۔ امام نے اُسے اپنے گھر پردے میں بٹھا دیا تھا اور وہ سفید برقعے میں باہر نکلا کرتی تھی۔ وہ شوقین مزاج نہیں تھی، نہ سیدھی سادی تھی۔ اُس کا باپ غریب سا بڑھئی تھا جو لوگوں کے گھروں کا کام کرتا تھا۔ لڑکی امام کے گھر میں گھریلو کاموں میں دلچسپی لیتی تھی۔ امام کی پہلی بیوی کا ناصرہ کے ساتھ اچھا سلوک تھا۔ ناصرہ نے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔

سب انسپکٹر علی رضا مرحوم امام سے جو باتیں پوچھ رہا تھا، یہ محض رسمی کارروائی تھی۔ ہمارے معاشرے میں کسی کے گھر کی باتیں اور ڈھکے چھپے حالات معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہماری چار دیواری کے کان ہی نہیں آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ علی رضا کو یہ سارے احوال و کوائف اپنے خفیہ ذرائع سے معلوم کرنے تھے۔ امام کو معلوم نہیں تھا کہ تھانیدار اس طرح بال کی کھال اُتارنے لگے گا۔

امام نے کہا— "آپ میری بیوی کے باپ سے کہیں کہ لڑکی، زیور اور رقم مجھے واپس کر دے۔ میں اُسے بخش دوں گا۔ آپ اُسے تھانے بلا کر ڈرائیں۔"

"اگر لڑکی اور چوری کا مال اُس سے برآمد ہُوا تو آپ اُسے بخش سکتے ہیں، قانون نہیں بخشے گا"— علی رضا نے کہا— "میں اُسے نہیں

بخشوں گا.... آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس لڑکی کے ساتھ آپ کی شادی کس نے کرائی تھی؟ کیا آپ نے خود رشتہ مانگا تھا؟"

"چوہدری صاحب نے کرائی تھی" — امام نے جواب دیا اور دو اور آدمیوں کا نام لیا جو اُونچی ذاتوں کے مسلمان تھے۔

علی رضا کو ایک اور شک ہُوا کہ امام کی پہلی بیوی نے یقیناً امام کی دوسری شادی کو پسند نہیں کیا ہوگا۔ کوئی بیوی اپنے گھر میں سَوکن کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ ممکن تھا کہ امام کی پہلی بیوی کے باپ اور بھائیوں نے ناصرہ کو اغوا کر کے قتل کر دیا ہو اور امام کو مزید سزا دینے کے لئے زیور اور روپیہ بھی اُڑا لے گئے ہوں۔ علی رضا نے اپنا یہ شک رفع یا پختہ کرنے کے لئے امام سے بہت کچھ پوچھا۔ امام نے ٹھوس جواب اور دلائل دے کر علی رضا کا شک رفع کر دیا۔ اُس نے یقین دلا دیا کہ اُس کی پہلی بیوی نے ناصرہ کو ناپسند نہیں کیا اور اُس کے بھائی اس قماش کے آدمی نہیں۔

خدا غریب کو بیٹی نہ دے

سب انسپکٹر علی رضا مسلمانوں کے معاملے میں میری طرح جذباتی بلکہ جنونی تھا۔ وہ قصبہ جس کے تھانے میں وہ مجھے یہ واردات سنا رہا تھا، ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت کا قصبہ تھا۔ مسلمان گھرانے تھوڑے سے تھے۔
علی رضا یہ سوچ رہا تھا کہ غیر مسلموں میں ایک مسلمان کی بے عزتی نہ ہو۔ امام کی بے عزتی کو وہ اسلام کی توہین سمجھتا تھا۔ اُسے شک ہو گیا تھا کہ امام کی شادی اس نوجوان لڑکی کے ساتھ کرانے والوں نے امام کے ساتھ کوئی ناٹک کھیلا ہے یا اسے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں، یا امام خود ہی کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔ بڑا ہی رسوا کُن سکینڈل بن رہا تھا۔

علی رضا نے مجھے بتایا کہ اُس نے امام کو یہ تاثر دیا کہ اُس کی رپورٹ

درج کر لی گئی ہے اور باقاعدہ تفتیش شروع کی جا رہی ہے لیکن اُس نے کوئی رپورٹ نہ لکھی۔ اُس کا ارادہ یہ تھا کہ در پردہ یعنی غیر سرکاری طور پر معلوم کرے گا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ کرے گا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ یہ پولیس کا طریقہ کار نہیں ہوتا۔ رپورٹ رجسٹر کی جاتی ہے اور اس کی تفتیش ہوتی ہے یا رپورٹ درج نہیں کی جاتی اور کوئی تفتیش نہیں ہوتی۔ تھانیدار جرأت مند اور دانشمند ہو تو وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علی رضا نے جو طریقہ اختیار کیا وہ اچھا تھا البتہ اس کی نیت اچھی تھی۔

وہ شام کے بعد پرائیویٹ کپڑوں میں ناصرہ کے باپ کے گھر چلا گیا۔ باپ غریب سا بڑھئی تھا۔ تھانیدار کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ علی رضا نے اُس کے ساتھ تھانیداروں والا سلوک نہ کیا۔ دوستانہ بے تکلفی سے پیش آیا۔ بڑھئی نے ہاتھ جوڑ کر فریادیں شروع کر دیں کہ اُس کی بیٹی اُس کے گھر نہیں آئی اور اُسے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔
علی رضا نے ابھی اُس کی بیٹی کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی لیکن بڑھئی نے پہلے ہی اپنی صفائی پیش کر دی اور زار و قطار رونے لگا۔ اُس نے جب یہ کہا کہ مجھ پر پہلے ہی بہت ظلم ہو چکا ہے، اب آپ مجھے گرفتار کرنے آگئے ہیں، تو علی رضا چونکا۔ اُس نے بڑھئی سے کہا کہ وہ اُسے بتائے کہ اُس پر کیا ظلم ہُوا ہے اور کس نے ظلم کیا ہے۔

"تین روز گزرے مولوی صاحب، چوہدری اور دو اور آدمی میرے گھر آئے" — بڑھئی نے کہا — "مجھ سے میری بیٹی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہے۔ میں بہت حیران ہُوا۔ وہ تو مولوی صاحب کے گھر تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ وہ ادھر بھی نہیں آئی۔ چاروں نے مجھے میرے صحن میں میری بیوی کے سامنے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ اپنی بیٹی کو تم نے چھپا لیا ہے۔ اُنہوں نے میرے گھر کی تلاشی لی۔ میری بیوی کی بھی بے عزتی کی۔ اب ان میں سے کوئی

نہ کوئی جب چاہتا ہے میرے گھر میں آجاتا ہے، مجھے اور میری بیوی کو گالی گلوچ کر کے چلا جاتا ہے۔"

اُس نے ہچکیاں لے کے روتے ہوئے کہا — "خُدا کسی غریب کو بیٹی نہ دے۔ بیٹی دے تو بدصورت دے۔ میری بیٹی کی طرح خوبصورت نہ ہو۔"

علی رضا نے مجھے بتایا کہ بڑھئی اور اُس کی بیوی غُربت اور چوہدریوں کی غلامی کے مارے ہوئے تھے لیکن ان کے چہروں کے رنگ اور نقش بہت اچھے تھے۔ بیوی بڑھاپے میں بھی اچھی لگتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی بیٹی کتنی خوبصورت ہوگی۔ علی رضا نے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی اور اسے کہا کہ وہ کسی سے نہ ڈرے اور اب کوئی بھی اُسے مارنے پیٹنے یا بے عزتی کرنے نہیں آئے گا۔

بڑھئی سے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں کہ امام "کتاب نکال کر" مستقبل کا حال بتاتا تھا۔ قارئین "کتاب نکالنے" کی اصطلاح سمجھتے ہوں گے۔ ہندوؤں کے پنڈت اور جوتشی پوتھی سے قسمت کا حال بتایا کرتے ہیں اور ہمارے ہاں بعض مولوی (عموماً مسجدوں کے امام) قرآن سے فال نکالتے یا کسی اور طریقے سے "حساب جوڑتے" اور سائل کو بتاتے ہیں کہ اُس کی مشکل کس طرح حل ہوگی اور یہ کہ اُس کے گھر پر بیماری کا یا کسی اور مصیبت کا جو حملہ ہوا ہے، یہ فلاں نے تعویذ کراتے ہیں وغیرہ۔ اسے "کتاب نکالنا" کہتے ہیں۔

یہ امام "کتاب نکالنے"، دم درود کرنے، وظیفے مع اجازت بتانے، آدھے سر کا درد پھونک مار کر رفع کرنے اور کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتی تو یہ بتانے میں شہرت رکھتا تھا کہ چیز کہاں ہے یا کس نے چرائی ہے۔ وہ "لوٹا پھیر کر" بھی چور کا نام پتہ معلوم کرنے میں مشہور تھا — اب اُس کی اپنی بیوی گم ہو گئی تو وہ سب انسپکٹر علی رضا کے پاس چلا گیا تھا۔

بڑھئی نے علی رضا کو بتایا کہ اُس کی بیوی کو آدھے سر کا درد رہتا تھا۔ اس کے لئے وہ امام کے پاس جایا کرتی تھی۔ دو تین بار اُس نے اپنی بیٹی کو امام کے گھر کھانا لے جانے کے لئے بھیجا۔ لڑکی چونکہ خوبصورت تھی اس لئے امام کی نظر پھر گئی۔ ایک روز چوہدری (کھالوں کا تاجر) اپنی حیثیت کے دو آدمی ساتھ لئے بڑھئی کے گھر گیا اور اسے کہا کہ وہ خوش نصیب ہے کہ مسجد کے پیش امام نے جس کے ہاتھ میں خدا نے شفا بھی دی ہے اور کرامات بھی، اُس کی بیٹی کو اپنی بیوی بنانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

بڑھئی نے کہا کہ مولوی صاحب کی پہلے بھی ایک بیوی ہے اور ان کے بچے بھی ہیں اور ان کی عمر بھی زیادہ ہے۔ چوہدری نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ تم یہ بھی کہہ دو گے کہ مولوی صاحب جسم کے بہت موٹے اور رنگ کے کالے ہیں اس لئے تم انہیں اپنی بیٹی کا رشتہ نہیں دو گے۔ "اگر تم نے ایسی بکواس زبان سے نکالی تو تمہاری زبان کھینچ لیں گے" — چوہدری نے بڑھئی سے کہا۔

مختصر یہ کہ ان لوگوں نے بڑھئی کو گھیر کر اس پر ایسا دباؤ ڈالا کہ اس کی بیٹی کی شادی امام کے ساتھ کر دی۔ علی رضا کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بڑھئی نے بتایا کہ لڑکی بہت روتی تھی۔ شادی تو اس کی ہونی ہی تھی لیکن یہ تو کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ اسے اپنی عمر سے دُگنی سے بھی زیادہ عمر کے آدمی کے حوالے کر دیا جائے گا اور اس کی ایک سوکن بھی ہوگی۔ لڑکی بہت پریشان رہنے لگی۔ وہ کبھی کبھی ماں باپ کے پاس آتی تھی اور روتی تھی۔ امام اسے مارتا پیٹتا بھی تھا۔ اپنی سوکن کے خلاف اُس نے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔

جس روز امام، چوہدری اور دو اور آدمیوں کو ساتھ لے کر بڑھئی کے گھر یہ معلوم کرنے گیا کہ ناصرہ یہاں تو نہیں آئی، اس سے دو روز پہلے (بڑھئی نے بتایا کہ) ناصرہ آئی تھی۔ وہ اپنا سارا زیور ساتھ لائی تھی۔ اُس

نے زیور اپنے ماں باپ کو دے کر کہا تھا کہ یہ امام کے گھر میں محفوظ نہیں اس لئے اپنے گھر رکھ لیں۔ ماں باپ نے اُس کی ضد پر زیور رکھ لیا تھا لیکن انہیں اچھا نہ لگا۔ ناصرہ چلی گئی تو بڑھئی اور اُس کی بیوی نے آپس میں بات کی اور یہ فیصلہ کیا کہ زیور امام کے گھر چھوڑ آئیں۔

شام کو بڑھئی مسجد میں نماز پڑھنے گیا تو زیور ساتھ لیتا گیا۔ نماز کے بعد اُس نے زیور امام کو دے کر کہا کہ اُس کی بیٹی یہ زیور اس لئے گھر چھوڑ آئی تھی کہ یہاں زیادہ محفوظ رہے گا لیکن اسے (بڑھئی کو) اچھا نہیں لگا کہ وجہ خواہ کچھ ہی ہو، بیٹی کا زیور ماں باپ کے گھر پڑا رہے۔
امام نے زیور رکھ لیا اور غصّے کا اظہار بھی کیا کہ اُس کی بیوی زیور ماں باپ کو کیوں دے آئی تھی۔ اگلے ہی روز امام، چوہدری اور دو معزّز آدمیوں کو ساتھ لے کر بڑھئی کے گھر گیا۔ اسے مارا پیٹا اور اس کے گھر کی تلاشی لی۔ وہ اسے کہتے تھے کہ تمہاری بیٹی امام کے گھر سے زیور اور سات سو روپیہ چوری کر کے بھاگ آئی ہے۔ بڑھئی انہیں کہتا رہا کہ وہ زیور امام کو کل ہی دے آیا ہے لیکن اُس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔

علی رضا کو یہ کار آمد سراغ ملا کہ لڑکی گھر سے بھاگنے سے پہلے اپنا زیور ماں باپ کو دینا چاہتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کا بھاگنے کا پروگرام پہلے سے طے تھا۔ بڑھئی کو (اس کے اپنے بیان کے مطابق) اپنی بیٹی کے ارادوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ علی رضا کے کرید کرید کر پوچھنے پر بڑھئی نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُسے امام کے سات سو روپوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔
اگر بڑھئی کو زیور اور روپے پیسے کا لالچ ہوتا تو وہ زیور امام کو واپس نہ کر آتا۔ بہرحال بڑھئی کی ہر بات کو سچ نہیں مانا جاسکتا تھا۔

لڑکی پر خواجہ صاحب کی نظر پڑ گئی

علی رضا نے بڑھئی سے پوچھا کہ اُس کی بیٹی کا رشتہ کسی اور نے بھی مانگا تھا؟ — بڑھئی نے بتایا کہ خواجہ صاحب نے رشتہ مانگا تھا لیکن اُس وقت امام کے ساتھ شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا تھا۔
یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ خواجہ صاحب کون تھے۔ خواجہ باقاعدہ پیر یا مُرشد نہیں تھا۔ اُس کی تھوڑی سی زمین تھی جس کی پیداوار پہ اُس کی گزر بسر تھی لیکن قصبے کے حیثیت والے مسلمان بھی اُس کا احترام کرتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو درویش کہا کرتا تھا۔ تعویذ دیتا تھا اور وہ جنّ اور آسیب سے نجات دلانے میں شہرت رکھتا تھا۔ یہ جس دَور کی کہانی ہے، اُس وقت دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ فوجی بھرتی عام تھی اور فوجیوں کو دھڑا دھڑ جنگ کے مختلف محاذوں پر بھیجا جا رہا تھا۔
جن گھروں کے بیٹے محاذوں پر چلے گئے تھے، اُن گھروں میں ماتم کا سماں رہتا تھا۔ فوجیوں کے باپ، اُن کی مائیں، بہنیں اور بیویاں اُن کی سلامتی کے لئے پیروں، فقیروں اور مزاروں کے دروازوں پہ ماتھے رگڑتی رہتی تھیں۔ اُن دنوں تعویذوں کی منڈی خوب چلی تھی۔
خواجہ پہلے ہی درویش تھا۔ جنگ کے دوران وہ مشہور ہو گیا۔
بڑھئی نے بتایا کہ اُس کا ایک ہی بیٹا ہے، وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔

اُسے بڑھئی کے کام کے لئے ہی بھرتی کیا گیا تھا۔ بڑھئی کی بیوی خواجہ کے پاس یہ دُعا کرانے جایا کرتی تھی کہ اُس کا بیٹا ہندوستان میں ہی رہے، اُسے محاذ پر نہ بھیج دیا جائے۔ بڑھئی بھی خواجہ کو سلام کرنے جایا کرتا تھا۔ جب ناصرہ کی شادی کا دن مقرر ہو گیا تو ناصرہ بھی اپنی ماں کے ساتھ خواجہ کے سلام کو گئی۔
خواجہ کی نظر لڑکی پر پڑی تو اُس کی نظر ناصرہ سے ہٹ نہ سکی۔ خواجہ

مراقبے میں چلا گیا اور اُس نے مراقبے سے بیدار ہو کر ناصرہ اور اُس کی ماں کو بتایا کہ ان کا لڑکا محاذ پر جانے والا ہے لیکن اُسے روکنے کے لئے میں ایک چِلّہ کاٹوں گا، پھر بڑھئی کا بیٹا ہندوستان میں ہی رہے گا۔ خواجہ نے ماں بیٹی کو کچھ پڑھنے کے لئے بتایا اور ان پر اُس نے اپنا جال پھینک دیا۔

ماں بیٹی اُس کے پاس جاتی رہیں۔ ایک روز خواجہ نے بڑھئی کو بلایا اور اپنے اُوپر مستانہ سی کیفیت طاری کر کے کہا کہ ناصرہ کی شادی اُس کے ساتھ کر دے، ورنہ چِلّہ بھی اُلٹ جائے گا اور اُس کا کوئی تعویذ اثر نہیں کرے گا۔ بڑھئی نے اُسے بتایا کہ تین چار روز بعد ناصرہ امام کی بیوی بن جائے گی۔ دن مقرر ہو چکا ہے۔ یہ سُنتے ہی خواجہ مستانہ کیفیت سے چونک کر بیدار ہو گیا۔ اُس نے بڑھئی کو ڈرایا کہ ناصرہ کسی اور کی بیوی بن گئی تو ناصرہ کے بھائی کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ بڑھئی نے اُسے کہا کہ وہ مجبور ہے۔ اُسے چوہدری اور اُس جیسے دو آدمیوں نے مجبور کیا تھا کہ وہ بیٹی کا رشتہ امام کو دے دے۔

"میں تمہیں ایک طریقہ بتاتا ہوں"۔۔۔ خواجہ نے بڑھئی سے کہا۔۔۔ "اپنی بیٹی کو میرے گھر چھوڑ جاؤ اور مشہور کر دو کہ وہ امام کے ساتھ شادی کرنے پر راضی نہیں تھی اس لئے گھر سے بھاگ گئی ہے۔ میں اسے چھپائے رکھوں گا۔ ڈیڑھ ایک مہینہ گزر جائے گا تو میں تمہاری بیٹی کے ساتھ شادی کر لوں گا۔ امام اور دوسرے لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

بڑھئی غریب اور کمزور آدمی تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر خواجہ سے کہا کہ وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ خواجہ نے اُسے ڈرایا، دھمکایا، لالچ بھی دیئے لیکن وہ پریشان ہونے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے علی رضا کو روتے ہوئے بتایا کہ خُدا اُسے جانے کون سے گناہ کی سزا دے رہا تھا کہ نوجوان بیٹی اپنے باپ کی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہی جا رہی تھی اور خواجہ اُس کے بیٹے کے لئے جو چِلّہ کاٹ رہا تھا، وہ اُس نے

چھوڑ دیا تھا۔ بڑھئی کا ایک ہی بیٹا تھا جو فوج میں چلا گیا تھا۔ وہ امام کے ساتھ اپنی بہن کی شادی پر ماں باپ سے ناراض ہو گیا تھا۔

علی رضا کے پوچھنے پر بڑھئی نے بتایا کہ اُس نے بیٹی کا رشتہ امام کو دینے سے پہلے اپنے بیٹے کو خط لکھا تھا کہ چوہدری وغیرہ کے کہنے پر وہ ناصرہ کا رشتہ امام کو دے رہا ہے۔ بیٹے نے جواب میں لکھا تھا کہ ناصرہ پر یہ ظلم نہ کیا جائے اور امام کو صاف جواب دے دیا جائے۔ بڑھئی نے اُسے ایک اور خط لکھا کہ وہ انہی چوہدریوں کے گھروں کا کام کر کے پیٹ پالتے ہیں اور امام مسجد کو خُدا نے جو رُتبہ دیا ہے، اس کے آگے ایک غریب بڑھئی سر نہیں اُٹھا سکتا۔

بڑھئی کے بیٹے نے اُسے لکھا کہ وہ ناصرہ کو اُس کے پاس چھوڑ جائے۔ وہ اپنے ایک دوست کے فیملی کوارٹر میں اپنی بہن کو رکھے گا۔ بڑھئی کا بیٹا لاہور چھاؤنی میں تھا۔ غریب باپ نے اُسے لکھا کہ ناصرہ کے ساتھ وہ خود اور ناصرہ کی ماں بھی لاہور آ جائے تو بہتر ہے ورنہ بیٹی کو بھیج دیا گیا تو یہاں قصبے میں بیٹی کے والدین کا جینا حرام ہو جائیگا۔

آخر ناصرہ کی شادی امام کے ساتھ کر دی گئی۔ ناصرہ کا بھائی شادی پر نہ آیا۔ اس کی بجائے اُس کا خط آیا جس میں اُس نے اپنے باپ کو لکھا کہ وہ سمجھے کہ اُس کا بیٹا مر گیا ہے اور بیٹا سمجھے گا کہ اُس کے ماں باپ مر گئے ہیں۔

علی رضا نے بڑھئی سے پوچھا کہ اُس کا بیٹا اپنی بہن کا رشتہ کِسے دینا چاہتا تھا؟ بڑھئی نے بتایا کہ اُس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ علی رضا نے یہ بھی پوچھا کہ لڑکی کا رشتہ کِسی نے مانگا تھا؟ بڑھئی نے تین چار میل دُور کے ایک گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ وہاں سے دو گھروں کے پیغام آئے تھے لیکن ناصرہ کا بھائی ان میں سے کسی کو بہن کا رشتہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے ماں باپ کو وجہ تو نہیں بتائی تھی لیکن اُس نے شاید یہ سوچا ہو گا کہ لڑکی اتنی خوبصورت اور اتنے اچھے رنگ

کی ہے کہ اچھے گھرانے میں جاسکتی ہے۔

علی رضا نے بڑھئی سے پوچھا، کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ان گھرانوں میں سے کسی نے لڑکی کو ورغلا لیا ہو یا اغوا کر لیا ہو؟ — بڑھئی نے پورے وثوق سے کہا کہ دونوں گھرانے اُسی کی طرح غریب اور کمزور ہیں۔ اُن کی اپنی لڑکی اغوا ہو جاتے تو وہ بے چارے کچھ نہیں کر سکتے۔ علی رضا نے اس سے پوچھا کہ اُس نے اگر بیٹے کے خطوط سنبھال کر رکھے ہُوئے ہیں تو دکھائے۔ بڑھئی خطوط لے آیا۔

علی رضا نے ہر ایک خط پڑھا۔ بہن کی شادی کے خلاف بڑھئی کے بیٹے نے جو خطوط لکھے تھے، وہ بڑے سخت تھے۔ ناصرہ کی شادی کے بعد باپ نے بیٹے کو خط لکھا تھا، اس کے جواب میں بیٹے نے لکھا تھا — "اگر میری بہن اس خاوند کے ساتھ خوش نہ ہُوئی تو میں اس آدمی کو قتل کر دوں گا" — ایک خط میں اُس نے لکھا تھا — "اگر میری بہن کو مولوی نے طلاق دے دی تو مجھے بہت خوشی ہو گی"

ان خطوط کے جو الفاظ اور جو لہجہ تھا، اس سے یہ شک ہوتا تھا کہ بھائی نے خود آکر بہن کو امام کے گھر سے فرار کرایا اور اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ علی رضا نے سوچا، اگر ایسا ہی ہُوا ہے تو کیا بڑھئی کو اس کا علم ہو گا؟ بظاہر بڑھئی اتنا دلیر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ علی رضا نے اسے کہا کہ اگر لڑکی یا زیور اور رقم اس کے پاس ہے تو وہ اس کے حوالے کر دے۔ اس کے خلاف کیس نہیں بنایا جاتے گا۔ یہ سُن کر اُس کی حالت بہت بُری ہو گئی۔

قسم اور خون کا انگوٹھا

علی رضا نے بڑھئی کی بیوی سے الگ پوچھ گچھ کی۔ اُس نے جو بیان دیا وہ اس کے خاوند کے بیان کی تصدیق تھا۔ مائیں اپنی بیٹیوں کی

ہمراز ہوتی ہیں۔ علی رضا نے اس عورت سے یہ راز اگلوانے کی بہت کوشش کی کہ ناصرہ کسے چاہتی تھی لیکن ماں کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ علی رضا نے اُسے کہا کہ ان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بتا دیں کہ لڑکی کہاں ہے یا وہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ ماں کچھ بھی نہ بتا سکی۔ ضروری نہیں تھا کہ بڑھئی اور اُس کی بیوی نے جو کچھ کہا تھا اسے سچ مان لیا جاتا۔ علی رضا یہ جائزہ لے رہا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا یہ کیس رجسٹر کرنا چاہیئے؟ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ پولیس کا طریقۂ کار نہیں ہوتا جو علی رضا نے اختیار کیا تھا۔ وہ اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے رہا تھا۔

یہ یقین ہونے لگا تھا کہ لڑکی کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ وہ اپنے کسی چاہنے والے کے ساتھ گئی ہے۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ وہ کسے چاہتی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بہت دلیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لڑکیاں اپنی سہیلیوں کو اپنے راز دیا کرتی ہیں۔ محبت ایسا جذبہ ہے جو ہمراز کا مطالبہ کرتا ہے۔ ناصرہ کی ماں سے پوچھا کہ اس کی بیٹی کی گہری سہیلیاں کون کون سی ہیں۔ اُس نے دو لڑکیوں کے نام بتاتے۔

علی رضا نے ناصرہ کی ماں سے کہا کہ وہ دونوں کو اس طرح لے آتے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ دونوں غریب گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ ناصرہ کی ماں نے اُن کے ماں باپ سے کہا کہ اُس کے گھر میں تھانیدار آیا ہے اور لڑکیوں کو بلاتا ہے۔ ان کے باپ اور مائیں بھی ساتھ ہی آگئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ناصرہ لاپتہ ہو گئی ہے۔ علی رضا نے لڑکیوں اور ان کے ماں باپ کو بڑے اچھے طریقے سے سمجھا دیا کہ وہ کسی کو نہ بتائیں کہ وہ رات اس گھر میں آیا تھا اور اُس نے ان سے کوئی بات کی تھی۔

دونوں لڑکیاں نوجوان اور غیر شادی شدہ تھیں۔ بات کرتے گھبراتی تھیں۔ علی رضا نے بڑی مشکل سے ان سے راز اگلوا لیا۔ دونوں نے بتایا کہ ناصرہ ایک جوان سال آدمی کو چاہتی تھی اور وہ آدمی اس پر جان نثار کرتا تھا۔

"وہ کون ہے؟"

"اُسی چوہدری کا بیٹا جس نے بڑھتی کو ڈرا دھمکا کر اس کی بیٹی کا رشتہ امام کو دلوایا تھا۔"

علی رضا کا دماغ روشن ہو گیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ چوہدری نے بڑھتی پر کیوں دباؤ ڈالا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو امام کے ساتھ بیاہ دے۔ علی رضا نے لڑکیوں سے جو کچھ معلوم کیا، اس سے اُس کا شک یقین میں بدل گیا۔ لڑکیوں سے اُس نے یہ معلومات لیں کہ لڑکی اور اس لڑکے کی محبت پاک تھی۔ وہ چوری چھپے ملتے تھے۔ ناصرہ نے اپنی ان دونوں سہیلیوں کو بتایا تھا کہ اُس نے چوہدری کے بیٹے سے قرآن پر قسم لی تھی کہ وہ ناصرہ کے ساتھ پاک محبت کرے گا۔

ناصرہ نے سہیلیوں کو یہ بھی بتایا تھا کہ چوہدری کے بیٹے نے ایک کاغذ پر لکھا تھا کہ ہم خُدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قسم کھاتے ہیں کہ کسی اور سے شادی نہیں کریں گے۔ ہم میاں بیوی بنیں گے یا خودکشی کر لیں گے ___ ناصرہ اَن پڑھ تھی۔ یہ تحریر اُسے چوہدری کے بیٹے نے پڑھ کر سنائی تھی۔ اُس نے ایک ملاقات پر اپنی انگلی سے خون نکال کر اس تحریر پر اپنا نام خون سے لکھا تھا، اور ناصرہ نے اپنا خون نکال کر اپنے انگوٹھے پر مَلا اور اس تحریر کے نیچے انگوٹھا لگایا تھا۔

"شادی کے بعد بھی وہ ملتے رہے؟"

"جی ہاں! ناصرہ اپنے گھر آتی اور چوہدری کے بیٹے سے ملتی تھی۔ کبھی وہ رات کھیتوں میں بھی ملتے تھے۔ ناصرہ گھومنے پھرنے کے بہانے ہمارے پاس آتی اور ہم اکٹھی کھیتوں کو نکل جاتی تھیں۔ وہ وہاں موجود ہوتا تھا۔ ناصرہ ہم سے الگ ہو جاتی تھی۔"

"ناصرہ تمہیں ان ملاقاتوں کے متعلق بتاتی ہو گی کہ کیا باتیں ہوتی تھیں۔"

"نہیں .... شادی کے بعد وہ کچھ نہیں بتاتی تھی۔ ہم نے اُسے کہا تھا کہ خُدا اور رسولؐ کی قسم اور خون کا انگوٹھا کہاں گیا؟ .... وہ کوئی جواب

نہیں دیتی تھی۔ کبھی ہنس پڑتی اور کبھی اداس ہو جاتی تھی۔"

راز کی بات کھُلتی آ رہی تھی۔

دونوں قسمت کا حال بتاتے تھے

اگر ان لڑکیوں نے سچ کہا تھا تو ناصرہ کو چوہدری کا بیٹا لے گیا تھا۔ اگر وہی لے گیا تھا تو اُسے گھر میں نہیں ہونا چاہیئے۔ علی رضا بڑھتی کے گھر سے چلا گیا۔ دوسرے دن اُس نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ معلوم کرے کہ فلاں چوہدری کا بیٹا یہیں ہے یا کہیں گیا ہُوا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل مسلمان تھا۔ وہ چوہدری کے بیٹے کو اچھی طرح جانتا تھا اور ان کی میل ملاقات بھی ہوتی رہتی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ اس لڑکے کو اُس نے گذشتہ شام دیکھا ہے۔ یہیں ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھنے پر علی رضا کو چوہدری کے بیٹے کے متعلق صرف یہ معلوم ہُوا کہ خوبرو جوان ہے، خودسر ہے، زندہ دل ہے اور دل گُردے والا ہے ___ علی رضا اور بھی بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے دو کام کئے۔ ایک یہ کہ ایک کانسٹیبل کو خواجہ کے ہاں بھیجا کہ اُسے علی رضا نے گپ شپ کے لئے تھانے بلایا ہے اور دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے دو مُخبر بلا کر انہیں کہا کہ چوہدری کے بیٹے کے متعلق جس قدر معلومات مل سکتی ہیں، لائیں۔

کچھ دیر بعد خواجہ آ گیا۔ علی رضا اُسے اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ خواجہ پوری طرح فدوی اور کمترین بنا ہُوا تھا۔ علی رضا نے اُسے کہا ___ "خواجہ صاحب! کوئی اچھا سا مال آئے تو کبھی ادھر بھیج دیا کرو۔"

"حکم حضور!" ___ خواجہ نے کہا ___ "ہم تو آپ کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔"

علی رضا نے کچھ دیر "اچھے سے مال" کی باتیں کیں۔ خواجہ پر جو گھبراہٹ طاری تھی وہ جاتی رہی۔ یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ دیہاتی علاقے اور گاؤں نما قصبے کے تھانیدار کو لوگ بادشاہ سمجھتے ہیں۔ شہروں میں آئی۔جی کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی جو دیہات کے تھانیدار کو حاصل ہوتی ہے۔

کچھ دیر گپ شپ لگا کر علی رضا نے امام کا نام لے کر خواجہ سے کہا — "اُس کی نئی بیوی سُنا ہے بھاگ گئی ہے۔"

"اُس نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی ہے؟" — خواجہ نے کہا — "اس لڑکی کو بھاگنا ہی تھا۔ اس بھینسے کے گھر اتنی خوبصورت اور کمسن لڑکی کیسے ٹھہر سکتی ہے .... وہ تھانے آیا تھا؟"

"آیا تھا" — علی رضا نے جواب دیا — "لیکن میں نے ابھی پرچہ نہیں کیا.... اگر آپ لڑکی واپس کر دیں تو آپ کے خلاف پرچہ نہیں کاٹوں گا اور معاملہ دبا لوں گا۔"

"میں لڑکی واپس کر دوں؟" — خواجہ نے حیرت سے کہا — "آپ کیا کہہ رہے ہیں حضور!"

"دیکھو خواجہ صاحب!" — علی رضا نے اُسے دوستوں کی طرح کہا —

"میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ نے کیا چکر چلا رکھا ہے لیکن آپ میرے دوست ہیں۔ آپ بھی دوستی کا حق ادا کریں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ معاملہ پردے میں رہے گا۔"

خواجہ اُچھلنے لگا۔ اُس نے کہا — "میں یہاں بیٹھا رہوں گا، آپ میرے گھر جا کر تلاشی لے لیں۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے یہ لڑکی اتنی اچھی لگی تھی کہ میں نے اس کے ماں باپ سے کہا تھا کہ اس کی شادی میرے ساتھ کر دیں لیکن اس کی بات مولوی کے ساتھ پکی ہو چکی تھی۔ اگر مجھے لڑکی کو اغوا کرنا ہوتا یا ورغلانا ہوتا تو میں شادی سے پہلے یہ کام کر سکتا تھا۔ میں اس لڑکی کو خرید سکتا تھا۔ میں اس لڑکی کو شادی کے بعد بھی اغوا کرا سکتا تھا اور غلا کر بھی غائب کر سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ لڑکی

اس مولوی کو سخت ناپسند کرتی ہے لیکن میں نے اس سے توجہ ہٹا لی تھی۔ لڑکی ایسی بھی حُور اور پری نہیں کہ میں اس کی خاطر اتنا بڑا جرم کر گزرتا۔ میرے قبضے میں اور بھی پریاں ہیں۔"

خواجہ بولتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی صفائی میں بولتا رہا، پھر اُس نے امام پر گالیاں برسانی شروع کر دیں — "میں جانتا ہوں اُس نے میرا نام مشتبہوں میں لکھوایا ہے، اور ہو سکتا ہے اُس نے صرف مجھ پر ہی شُبہ ظاہر کیا ہو۔ میں اُس کی اصلیت جانتا ہوں کیا ہے۔ وہ کتاب نکال کر لوگوں کو جھانسے دیتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی کرامات نہیں۔"

علی رضا نے مجھے بتایا کہ اُسے یاد آگیا کہ امام اور خواجہ میں کاروباری رقابت ہے۔ دونوں لوگوں کو قسمت کا حال بتاتے اور بگڑے ہوئے نصیبوں کی مرمت کیا کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف درپردہ پروپیگنڈہ کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے قصبے کے حیثیت اور اثر و رسوخ والے مسلمانوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان کی چپقلش اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اُسی سال عید الفطر کا چاند گہرے بادلوں کی وجہ سے نظر نہ آسکا۔ امام نے اعلان کر دیا کہ کل عید ہوگی۔ خواجہ نے باقاعدہ ڈھنڈورہ پٹوا دیا کہ کل عید نہیں ہوگی۔ چاند کسی نے نہیں دیکھا۔ چنانچہ اس قصبے میں جہاں مسلمانوں کی آبادی عورتوں اور بچوں کو ملا کر بمشکل ایک ہزار تھی، دو عیدیں پڑھی گئیں۔ ایک روز امام کی عید تھی، دوسرے روز خواجہ کی۔

جس رات لڑکی غائب ہوئی

علی رضا مجھے یہ روئیداد سُنا رہا تھا اور میں بڑی غور سے سُن رہا تھا، اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ علی رضا مجھے بتانا کیا چاہتا ہے اور یہ

کہانی ختم کہاں ہوگی۔ اُس نے کہا کہ خواجہ کی "درگاہ" کی مخبری مشکل نہیں تھی۔ وہاں شراب چلتی تھی۔ جواریوں میں ہندو اور سکھ بھی ہوتے تھے۔ خواجہ نے ایک شکرا اور ایک باز رکھا ہُوا تھا جن سے وہ شکار کھیلا کرتا تھا۔ اس کے خاص مصاحبوں میں دو تین ایسے جرائم پیشہ آدمی بھی تھے جو تھانے کے ریکارڈ پر تھے۔ یہ خواجہ کی نسبت تھانیدار کے زیادہ وفادار تھے۔ خواجہ کے اندرون خانہ بھی علی رضا کی مُخبر عورتیں موجود تھیں۔ یہ خواجہ کی دو بیگمات کی نوکرانیاں تھیں لیکن ان کا درپردہ کام یہ تھا کہ عورتوں کو خواجہ کی کرامات سناتی رہتی تھیں۔ ان کا شکار عموماً اچھی شکل وصورت کی عورتیں ہُوا کرتی تھیں۔

علی رضا نے خواجہ کو یہ تاثر دے کر کہ وہ بے گناہ ہے، اُسے رخصت کر دیا اور اُس کے پیچھے مُخبر ڈال دیئے جنہیں یہ کام دیا گیا کہ وہ خواجہ کی نقل وحرکت پر نظر رکھیں اور اس کے گھر سے معلوم کریں کہ وہاں بڑھئی کی بیٹی ہے یا نہیں۔

خواجہ پر شک کسی حد تک مضبوط تھا۔ امام کے خلاف اُس کے دل میں زہر بھرا ہُوا تھا۔ ناصرہ نے درمیان میں آکر ان کی دشمنی کو خونی دشمنی بنا دیا تھا۔ علی رضا کو نظر آنے لگا کہ اُسے کیس رجسٹر کرنا ہی پڑے گا لیکن وہ ابھی اپنے ارادے اور نیت سے مایوس نہیں ہُوا تھا۔ اُس کے سامنے دو مشتبہ آدمی آگئے تھے — چوہدری کا بیٹا اور خواجہ — تیسرا مشتبہ بڑھئی کا فوجی بیٹا بھی تھا۔ جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے فوجیوں کو اتنی زیادہ اہمیت دے دی تھی کہ کوئی فوجی گاؤں یا شہر میں آکر کوئی جُرم کر جاتا تو پولیس اُس پر ہاتھ ڈالتے گھبراتی تھی۔ انگریز افسر اُسے بچا لیا کرتے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ بڑھئی کا بیٹا ناصرہ کے ساتھ پہلے بات کر کے اُسے اپنے ساتھ لے گیا ہو اور اُس کے ماں باپ کو معلوم ہی نہ ہو۔

قصبے کی نمبرداری ہندو گھرانے میں تھی۔ ایک سفید پوش (انعام خور) مسلمان تھا۔ یہ لوگ سرکاری مُخبر ہُوا کرتے تھے بلکہ پولیس کی مدد اور

راہنمائی کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ علی رضا کو معلوم ہوگیا تھا کہ یہ سفید پوش خواجہ کا حامی ہے۔ علی رضا شام کے بعد اُس کے گھر چلا گیا۔ اُس کا انداز رسمی میل ملاقات اور گپ شپ کا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ سُنا ہے امام کی نئی بیوی لاپتہ ہوگئی ہے۔ کہاں چلی گئی ہوگی؟

سفید پوش نے امام کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور اُس نے چوہدری کے خلاف بھی باتیں کیں۔ چوہدری خواجہ کا مخالف اور مولوی کا حمائتی تھا۔ سفید پوش نے کہا کہ اس چوہدری نے غریب بڑھئی کی بیٹی کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ سفید پوش نے وہی قصہ سنا دیا جو بڑھئی اور اُس کی بیوی سُنا چکے تھے۔

"آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس چوہدری نے اس نوجوان لڑکی کو اس مولوی کے قید خانے میں کیوں قید کیا ہے" — سفید پوش نے کہا۔ علی رضا نے کہا کہ اسے معلوم نہیں۔ سفید پوش نے کہا — "چوہدری کے بیٹے نے چوہدری سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ بڑھئی کی بیٹی کو بیوی بنا کر گھر لائے گا۔ بیٹا بڑھئی کے گھر جایا کرتا اور کبھی رات رات بھی وہیں رہتا تھا۔ اس لڑکے نے تو بڑھئی کے گھر کو درگاہ بنا لیا تھا۔"

"اور تم لوگ دیکھتے رہے کہ ایک غریب کی بیٹی اور اُس کے ماں باپ بدنام ہو رہے ہیں؟" — علی رضا نے کہا — "چوہدری کے بیٹے نے لڑکی کو بے نکاحی بیوی بنا رکھا ہوگا۔"

"آپ کو شاید یقین نہ آئے" — سفید پوش نے کہا — "ہم بڑی غور سے دیکھتے رہے۔ لوگوں نے انہیں بدنام کیا لیکن میں نے ذاتی طور پر یقین کر لیا تھا کہ لڑکی لڑکے کی چاہت بالکل پاک ہے۔ نہ بدکاری چھپی رہتی ہے نہ سچی محبت۔ میں اس لڑکے کو جانتا ہوں۔ اس میں کوئی عیب نہیں۔ سر اُونچا کر کے بات کرتا ہے لیکن اس میں اپنی امیری کا غرور نہیں۔ اس کا باپ نیت کا بد ہے۔ اس لڑکی پر چوہدری اور اس کے بیٹے میں

اتنی دشمنی ہوگئی ہے کہ بیٹا چوہدری سے جائیداد کا حصہ مانگ رہا ہے۔ شاید وہ حصہ الگ کر بھی چکا ہے ....

"اس چوہدری نے بڑھئی کی بیٹی کی شادی سے پہلے بڑھئی کو بہت ذلیل وخوار کیا۔ بڑھئی کے پاس زیادہ تر کام چوہدری کا ہوتا ہے۔ لکڑی کے کھوکھے بناتا ہے۔ یہ بھی چوہدری کا کاروبار ہے۔ چوہدری نے دیکھا کہ اس کا بیٹا بڑھئی کی بیٹی سے ہٹ نہیں رہا تو اُس نے بڑھئی کو مارا پیٹا کہ وہ اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھے۔ اسی پر چوہدری اور اس کے بیٹے کی آپس میں عداوت شروع ہوگئی تھی۔ بیٹا باز نہ آیا تو چوہدری نے بڑھئی کو کام سے ہٹا دیا۔ وہ اپنے آپ کو بڑھئی کا اَن داتا سمجھتا تھا۔ یہ غلط نہیں تھا۔ بڑھئی بے روزگار ہوگیا۔ اُسے بیٹا فوج سے چند روپے بھیجتا تھا۔ اُسے بیٹی کا جہیز بھی بنانا تھا۔ غربت کی وجہ سے ہی وہ بیٹی کی شادی نہیں کر سکا تھا....

"چوہدری کا بیٹا بڑھئی کے گھر جانے لگا۔ سُنا ہے کہ وہ انہیں مالی امداد دیتا تھا۔ چوہدری نے جب دیکھا کہ بیٹا ہاتھ سے جا رہا ہے تو اُس نے لڑکی کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر لیا۔ اُس نے بڑھئی کو کام پر لگا لیا اور شرط یہ رکھی کہ بڑھئی اپنی بیٹی مولوی کے ساتھ بیاہ دے۔ اُس نے دو اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور اس غریب کو ایسا گھیرا اور اُسے ایسا ڈرایا کہ وہ بے چارہ اپنی اتنی خوبصورت اور کم عمر بیٹی کو اس کالے سانڈ کے ساتھ بیاہ دینے پر مجبور ہوگیا۔"

"کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ چوہدری کا بیٹا لڑکی کو لے اُڑا ہو؟"— علی رضا نے پوچھا — "اگر ایسا ہے تو اُس نے لڑکی کو کہاں رکھا ہوگا؟"

"لڑکا دلیر ہے"— سفید پوش نے کہا — "لڑکی کو اُڑا لے جانا اُس کے لئے مشکل نہیں، لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ اُسے اگر لڑکی کو اُڑا ہی لے جانا تھا تو جب شادی کا دن مقرر ہوگیا تھا، اُس وقت اُس نے لڑکی کو کیوں نہ غائب کر دیا؟ شادی ہوگئی، تین مہینے گزر گئے

تب اُسے خیال آیا کہ لڑکی کو اغوا کر لیا جاتے۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کسی اور کے ساتھ گئی ہے۔ وہ چاہتی تو چوہدری کے بیٹے کو ہی تھی لیکن اس لڑکے نے شاید مُنہ پھیر لیا تھا۔ لڑکی تنگ آکر کسی اور کے ساتھ بھاگ نکلی۔"

"کیا یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ جس رات لڑکی غائب ہوئی، اُس رات یا اگلے دو تین دن چوہدری کا بیٹا یہیں تھا یا کہیں چلا گیا تھا؟"— علی رضا نے پوچھا۔

"لڑکا تین دن غائب رہا"— سفید پوش نے کہا — "مجھے دوسرے دن ہی پتہ چل گیا تھا کہ مولوی کی نئی بیوی بھاگ گئی ہے۔ میرا اور میرے دوستوں کا پہلا شک چوہدری کے بیٹے پر ہُوا تھا۔ ہم نے پتہ کرایا تو معلوم ہُوا کہ چوہدری کا بیٹا گھر سے غائب ہے۔ وہ کل نظر آیا ہے۔"

علی رضا پر یہ راز کھل گیا کہ امام اور چوہدری تھانے میں لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ دینے آتے تھے تو دونوں کہتے تھے کہ انہیں بڑھئی پر شک ہے کہ اُس نے اپنی بیٹی کو چھپا لیا ہے اور زیور اور سات سو روپیہ ہضم کر لیا ہے۔ چوہدری تو بار بار کہتا تھا کہ بڑھئی کو بلا کر ڈرائیں۔ دراصل چوہدری کو بھی شک تھا (اور ہو سکتا ہے اُسے یقین بھی ہو) کہ لڑکی کو اُس کا اپنا بیٹا لے گیا ہے۔ وہ پولیس کا رُخ بڑھئی کی طرف پھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سفید پوش نے پردے چاک کر دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، لیکن ہماری چاردیواری کی دنیا کی دیواروں کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ لوگ اپنے گھروں پر پردہ ڈال کر دوسروں کے پردوں میں سے جھانکتے رہتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے اپنے گھر کی کوئی بات اور کوئی حرکت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ علی رضا کے مخبر حرکت میں آتے تو پتہ چلا کہ امام کے گھر کی تو کوئی بھی بات ڈھکی چھپی نہیں اور سارا محلّہ تماشائی ہے۔

امام کے گھر میں پہلے بھی ایک بیوی تھی۔ اُس پر وہ ایک نوجوان

اور خوبصورت بیوی لے آیا۔ وہ کیسے خاموش بیٹھی رہتی۔ وہ محلّے کی عورتوں کے آگے دل کا غبار ہلکا کرتی رہتی تھی۔ اُس نے اپنے گھر کے جو راز فاش کئے وہ اب مخبروں کے ذریعے علی رضا تک پہنچ گئے۔ معلوم ہُوا کہ ناصرہ تین مہینے امام کے گھر میں رہی اور اُس نے ایک دن بھی امام کو اپنا خاوند تسلیم نہیں کیا۔ اُس نے امام کو اپنے قریب نہ آنے دیا۔ پہلے امام اُس کی منّت سماجت کرتا رہا، پھر ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگا اور ڈیڑھ دو ماہ بعد اُس نے ناصرہ کی پٹائی شروع کر دی۔ پھر بھی ناصرہ یہی کہتی رہی کہ تمہارے ساتھ میرا نکاح نہیں پڑھا گیا، میں نے ہاں نہیں کہی تھی۔

امام کی پہلی بیوی نے اس صورتِ حال سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ وہ ناصرہ کی حمایت کرنے لگی اور اُس نے امام کے خلاف ناصرہ کی حوصلہ افزائی بھی خوب کی۔ امام اور ناصرہ کے درمیان لڑائی مار کٹائی اکثر رات کو ہُوا کرتی تھی۔ پہلی بیوی دوسرے کمرے میں ہوتی تھی۔ وہ دوڑی جاتی اور اُن کے درمیان آجاتی۔ وہ پختہ کار عورت تھی۔ امام کو شرمسار بھی کرتی اور اُسے دلاسہ بھی دیتی اور اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے جاتی۔

یہ اس گھر کا معمول بنا ہُوا تھا اور محلّے والوں کے لئے اچھا خاصا تماشہ۔ پڑوسیوں نے کئی بار امام کی یہ گرجدار آواز سُنی — "یہ دل سے نکال دے کہ میں تجھے طلاق دے دوں گا.... میں تجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھوں گا" — اور اس کے جواب میں ناصرہ کی للکار بھی سناتی دیتی رہتی تھی۔

لڑکی اور لڑکے کا رشتہ توڑنے کے لئے

علی رضا کو تفتیش کرتے تین دن گزر گئے۔ اس دوران امام اور چوہدری ایک بار صبح اور ایک بار شام کو اُس کے پاس آتے رہے۔

وہ پوچھتے تھے کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔ علی رضا انہیں ٹالتا رہا اور جھوٹی تسلّیاں دیتا رہا۔ چوتھے دن کی صبح طلوع ہوئی تو دونوں آ گئے۔ چوہدری نے علی رضا کے ساتھ ایسے لہجے میں بات کی جیسے وہ حکم دے رہا ہو۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا — "اتنے دن گزر گئے ہیں اور آپ نے ابھی تک اُس حرام خور بڑھئی کو تھانے میں طلب نہیں کیا۔"

علی رضا کا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے امام کو باہر بیٹھنے کو کہا اور چوہدری کو لپیٹ میں لے لیا۔

"یہ شادی تم نے کرائی تھی چوہدری؟"

"ہاں جی!" — چوہدری نے جواب دیا — "میں نے کرائی تھی۔"

"اور تم نے ایک نوجوان لڑکی کی شادی اُس کے باپ کی عمر کے آدمی کے ساتھ اس لئے کرائی تھی کہ تم اُس کے معتقد ہو۔"

"ہاں جی!" — چوہدری نے کہا — "پیش امام کا احترام ہم سب پہ فرض ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ دوسری شادی کریں گے۔ ہم نے اُن کے لئے یہ لڑکی پسند کر لی۔"

"تم نے پیش امام کو اپنی بیٹی کیوں نہ دے دی؟" — علی رضا نے کہا — "تمہارے ساتھ جو لوگ اُس بے چارے بڑھئی سے رشتہ لینے گئے تھے، اُن میں سے کسی نے اپنی بیٹی کیوں نہ دے دی؟ تم نے اپنی برادری کی کوئی لڑکی کیوں نہ پسند کی؟"

چوہدری نے یوں چونک کر علی رضا کو دیکھا جیسے اُسے کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔

"غور سے سُنو چوہدری!" — علی رضا نے کہا — "جو تم نے مجھ سے چھپا رکھا ہے وہ مجھ سے سُن لو، اور میں جو کچھ بھی تم سے پوچھوں وہ بالکل سچ بتانا۔ اگر جھوٹ بولا تو اس کمرے سے اُٹھا کر تمہیں ساتھ والے کمرے میں بٹھا دوں گا جسے حوالات کہتے ہیں۔ تھانے میں تمہاری

دولت اور تمہاری حیثیت کی کسی کو پرواہ نہیں ... تم نے ایک غریب کی بچّی پر جو ظلم کیا ہے، وہ میں بخش سکتا ہوں، خدا تمہیں نہیں بخشے گا۔ تم نے اس لڑکی کے ساتھ اپنے بیٹے کا تعلق توڑنے کے لئے لڑکی کی شادی اس مولوی کے ساتھ کرادی۔ تم نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ جوڑ ملتا بھی ہے یا نہیں۔ اس سے بہتر تھا کہ تم لڑکی کو قتل کرا دیتے۔ تم نے لڑکی کو سزا دی ہے۔ لڑکی اس سزا سے بھاگی ہے۔"

چوہدری کو توقع نہیں تھی کہ تھانیدار اُس کے ساتھ یہ سلوک کرے گا اور تھانیدار کو اندر کی باتوں کا بھی علم ہو جائے گا۔ وہ منہ کھولے ہوئے سُن رہا تھا۔

"تم نے امام کی بیوی کے بھاگ جانے کے بعد بڑھئی کو اُس کے گھر جا کر مارا پیٹا" — علی رضا نے کہا — "اُس کی بیوی کی بے عزّتی کی، پھر تم اُس کے گھر جب جی میں آئی چلے گئے اور اُسے مار پیٹ آئے۔ تم سمجھتے ہو کہ یہاں انگریز کا نہیں تمہارے باپ کا راج ہے۔ تم نے کسی کے گھر میں غنڈوں کی طرح گھُس کر اُسے مارنے پیٹنے کا جُرم کیا ہے جس کی گواہی سارا محلّہ دے رہا ہے۔ میں تمہارے خلاف پرچہ کاٹ رہا ہوں۔ پورے پانچ سال سزا تے قید دلاؤں گا۔"

چوہدری بلبلا اُٹھا۔ اُس نے لپک کر علی رضا کی ٹھوڑی پکڑ لی اور التجائیں کرنے لگا۔

"یہ سارا ڈرامہ تم نے شروع کیا ہے" — علی رضا نے کہا اور چوہدری کے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لئے اُس نے ایک اور گولہ داغا۔ اُس نے کہا — "تم نے دیکھا کہ تمہارا بیٹا اب بھی اس لڑکی سے ملتا ہے تو تم نے لڑکی کو غائب کر دیا ہے۔ اپنے جُرم پر پردہ ڈالنے کے لئے تم جُرم کا وزن غریب بڑھئی پر ڈال رہے ہو۔"

چوہدری اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ صاحبِ حیثیت تھا۔ قصبے میں اُس کی عزّت تھی۔ اپنی برادری پر اُس کا رُعب تھا لیکن علی رضا نے اُسے

آسمان سے گرا کر زمین پر پٹخ دیا تھا جہاں وہ مجرم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تھانے میں اُس کا رُعب نہیں چل سکتا۔ وہ علی رضا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ مجرم ضمیر نے اُسے رحم کا بھکاری بنا دیا۔ اُس نے علی رضا کے پاؤں چھُو کر، پھر ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اُس پر اتنا ذلیل الزام عائد نہ کیا جائے۔ علی رضا نے رحم نہ کیا۔ وہ انہی لوگوں کی عزّت پر پردہ ڈالنے کی خاطر خطرہ مول لے کر ضابطے کے خلاف تفتیش کر رہا تھا۔

"کیا یہ غلط ہے کہ تمہارا بیٹا اس لڑکی کو اتنا چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ شادی کرنے کی قسم کھا چکا تھا؟"

"ہاں حضور!" — چوہدری نے جواب دیا — "یہ صحیح ہے۔"

"اور تم نے لڑکی اور اپنے بیٹے کا تعلق توڑنے کے لئے لڑکی کی شادی امام سے کرائی تھی۔"

"جی حضور!" — چوہدری نے کہا — "یہ بھی صحیح ہے۔"

"جس رات لڑکی لاپتہ ہوئی، اُس رات تمہارا بیٹا گھر میں نہیں تھا" — علی رضا نے پوچھا — "وہ کہاں تھا اور کتنے دنوں بعد واپس آیا تھا؟ ... جھوٹ نہ بولنا۔"

چوہدری کے آنسو نکل آئے۔ سسکی سی لے کر بولا — "اولاد حرامی نکل آئے تو باپ کی یہی حالت ہو جاتی ہے جو میری ہو رہی ہے ... وہ تین دن غیر حاضر رہا۔"

"اور تم نے اُس کے واپس آنے کے بعد مولوی کو ساتھ لا کر اُس کی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں دی" — علی رضا نے کہا — "اس کی وجہ یہ تھی کہ تمہارا خیال تھا کہ لڑکی کو تمہارا بیٹا لے گیا ہے مگر وہ واپس آیا تو تم سمجھے کہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ پھر تم مولوی کو ساتھ لئے تھانے میں آ گئے۔"

"ہاں حضور!" — چوہدری نے کہا — "مجھے یہی شک تھا۔"

"اگر تمہیں معلوم ہے کہ لڑکی کو تمہارا بیٹا لے گیا ہے تو مجھے بتا دو"

—علی رضا نے کہا —"اگر مجھے کسی اور سے پتہ چلا تو تمہارے لئے بہت بُرا ہوگا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم نے بڑھئی کو اُس کے گھر میں جا کر مارنے پیٹنے کا جو جُرم کیا ہے، میں اس کی طرف توجہ نہیں دوں گا۔"

علی رضا نے مجھے سنایا کہ چوہدری اس قدر خوفزدہ ہو چکا تھا کہ اُس میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اُسے یقین ہوگیا تھا کہ علی رضا اُسے گرفتار کر لے گا۔ اُس نے روتے ہوئے قسمیں کھائیں کہ اُسے معلوم نہیں کہ لڑکی کو اُس کا بیٹا لے گیا ہے۔ علی رضا نے اس سے اور کئی ایک باتیں اگلوالیں۔ اُس نے اپنے بیٹے اور ناصرہ کے تعلقات کے متعلق وہی کچھ بتایا جو سفید پوش بتا چکا تھا۔ چوہدری نے مزید یہ بتایا کہ ناصرہ کی شادی امام کے ساتھ ہوگئی تو چوہدری کا بیٹا اپنے باپ سے باغی ہوگیا۔ کبھی تو شک ہوتا تھا جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو۔ وہ قتل کے سوا کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ چوہدری کو بھی قتل کی دھمکیاں دیتا تھا اور امام کو بھی۔

چوہدری نے بتایا کہ اُس کے بیٹے نے جائیداد اور روپے پیسے سے اپنا حصہ مانگنا شروع کر دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ امام کے ساتھ ناصرہ کی شادی چوہدری نے کرائی ہے اور اُسے مارا پیٹا بھی گیا ہے۔ بیٹے نے اپنے باپ کی یہ کارستانی اپنی ماں کو بتا دی تھی اور اُس نے یہ بات اپنے دونوں بھائیوں کو بھی بتائی تھی اور اپنی بہن کو بھی بتائی تھی۔ اب بیٹے نے باپ سے اپنا حصہ مانگنا شروع کر دیا تو بہن اور بھائیوں نے اپنے بھائی کی طرفداری کی اور باپ سے کہا کہ اس کا حصہ دے دو۔ چوہدری کے لئے یہ باعثِ شرم تھا کہ غیر شادی شدہ بیٹے کو الگ کر دے لیکن بیٹے نے اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ چوہدری نے مجبور ہو کر اسے حصہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بیٹا باپ کے ساتھ کاروبار کرتا تھا۔ وہ کاروبار بھی تقسیم کرانے کی ضد کر رہا تھا۔

وہ میری شرعی بیوی ہے

کسی پولیس آفیسر کو قانون نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ کسی ملزم کو سزا دے۔ اُس کا فرض تفتیش کرنا اور ثبوت مہیا کرنا ہے کہ یہ شخص فلاں واردات کا ملزم ہے۔ علی رضا چونکہ کسی اور نیت سے تفتیش کر رہا تھا اس لئے اُسے چوہدری اور امام پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے چوہدری کو باہر بھیج دیا اور امام کو اندر بلایا۔

"مولانا!"— علی رضا نے امام سے کہا —"آپ میرے پیش امام ہیں لیکن میری نوکری ایسی ہے کہ مجھے اپنے فرض کا زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کی بے ادبی ہو جائے تو مجھے معاف کر دینا.... آپ نے ایسا جُرم کیا ہے جس کی سزا سے میں آپ کو بچا نہیں سکتا۔"

امام بُری طرح بدکا اور سوالیہ نظروں سے علی رضا کو دیکھا۔

"آپ نے بڑھئی کے گھر میں گھُس کر اُسے کتنی بار زدوکوب کیا ہے"— علی رضا نے کہا —"آپ نے اُس کی بیوی کی بھی بے عزتی کی ہے۔ مجھے محلے کے دو تین معزز آدمی مجبور کر رہے ہیں کہ میں آپ کے خلاف کارروائی کروں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کے اِس جُرم کو دبا لوں مگر آپ اپنی نئی بیوی کو زدوکوب کرتے رہے ہیں اور بیسیوں گواہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے ایک غریب اور بوڑھے آدمی کو مار پیٹ کر اُس کی بیٹی کے ساتھ زبردستی شادی کی ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ لڑکی نے ایجاب و قبول کے وقت آپ کو قبول نہیں کیا تھا۔ آپ اُسے مار مار کر اپنی بیوی بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟"

امام کی زبان کھُل گئی۔ خوفزدہ لہجے میں بولا —"جناب! وہ میری شرعی بیوی ہے۔ آپ اُسے تلاش کریں۔"

"جناب!"— علی رضا نے کہا —"میں نے تو سُنا ہے کہ آپ

کتاب نکال کر غائب کا حال بھی بتا دیتے ہیں، آنے والے وقت کا بھی حال معلوم کر لیتے ہیں اور کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتے تو آپ بتا دیتے ہیں کہ وہ چیز کہاں رکھی ہے اور سنا ہے کہ آپ چور کا نام اور پتہ بھی بتا دیتے ہیں۔ آپ کو اپنی بیوی کے لئے مجھ جیسے گناہگار آدمی کے پاس آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"وہ معاملہ کچھ اور ہے" — امام نے کہا۔

"اور جناب مولانا! یہ معاملہ بھی کچھ اور ہے" — علی رضا نے کہا — "کیا آپ سچ کہتے ہیں کہ لڑکی زیور ساتھ لے گئی ہے؟ اور کیا واقعی وہ آپ کے گھر سے سات سَو روپیہ لے گئی ہے؟"

اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اتنا گھبرایا ہُوا تھا کہ اُس کی زبان ہکلا گئی۔ اُس نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تھی۔ بڑھئی علی رضا کو بتا چکا تھا کہ غائب ہونے سے دو روز پہلے ناصرہ اپنا زیور ماں باپ کو دے آئی تھی لیکن باپ سارا زیور امام کو دے آیا تھا۔

"محترم!" — علی رضا نے امام سے کہا — "یہ سوچ لیں کہ آپ جو کچھ کہیں گے وہ آپ کو ذلیل و رسوا کر سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لڑکی زیور اور سات سو روپیہ لے گئی ہے تو بڑے شوق سے کہہ دیں۔ میں آپ کو روک نہیں سکتا۔ میں آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ جھوٹ بولنے کا نتیجہ آپ کے لئے بہت بُرا ہوگا۔"

امام نے سَر جُھکا لیا اور دبی زبان سے کہا — "چوہدری صاحب نے کہا تھا کہ تھانے میں لڑکی پر اور اُس کے ماں باپ پر چوری کا الزام ضرور لگانا، ورنہ پولیس لڑکی کی تلاش میں دلچسپی نہیں لے گی" — اُس نے سَر اُٹھا کر کہا — "اور چوری کا الزام لگانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم بڑھئی کو ڈرانا چاہتے تھے۔ ہمیں امید تھی کہ وہ چوری کے الزام سے ڈر کر لڑکی واپس کر دے گا۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ لڑکی کا زیور آپ کے پاس ہے؟"

"جی!" — امام نے کہا — "میرے پاس ہے۔"

"اور وہ ایک پیسہ بھی آپ کے گھر سے نہیں لے گئی؟"

"نہیں" — امام نے کہا — "وہ کچھ بھی نہیں لے گئی۔"

علی رضا نے مجھے بتایا کہ اُسے بہت ہی افسوس ہُوا کہ اس شخص نے ایک غریب لڑکی پر ہی ظلم نہیں کیا، یہ اسلام کی توہین کا بھی مرتکب ہو رہا تھا۔ اُس نے 'کتاب نکالنے'، اور لوٹا پھیرنے اور دم درود کو اسلام بنا رکھا تھا۔ علی رضا کو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اُسے یہ کیس ریکارڈ پر لانا ہی پڑے، اس لئے اُس نے ہر ایک شہادت اور ثبوت فراہم کرنا ضروری سمجھا۔

اُس نے امام سے کہا کہ وہ اُس کی پہلی بیوی سے ملنا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے ناصرہ کے فرار میں اُس کا بھی ہاتھ ہو۔ امام نے یہ سُنا تو وہ پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا کہ اُس کی بیوی پردہ کرتی ہے۔ علی رضا نے کہا کہ وہ رات کو آئے گا اور اُس کی بیوی کو اُس کے سامنے بیٹھنا پڑے گا۔ امام نے کہا کہ وہ بھی پاس بیٹھے گا۔ علی رضا نے کہا کہ امام نے اُس کے کام میں اس طرح دخل اندازی کی تو اس کی بیوی کو تھانے بلایا جائے گا۔

رات کی گاڑی، دوسرا ٹکٹ

شہادت اکٹھی کرنے کے سلسلے میں علی رضا نے سوچا کہ لڑکی کو اگر چوہدری کا بیٹا لے گیا ہے تو اُسے کہیں باہر چھوڑ آیا ہے۔ اگر کسی گاؤں میں کسی دوست کے حوالے کر آیا ہے تو یہ معلوم کرنا ذرا مشکل ہوگا کہ وہ گاؤں کون سا ہے۔ اگر کسی دوسرے شہر میں لے گیا ہے تو وہ یا بس سے گیا ہوگا یا ریل گاڑی سے۔ اُن دنوں بسوں کی یہ بھرمار نہیں تھی۔ قصبے کی دو ہی بسیں تھیں جنہیں لاریاں کہا کرتے تھے۔ باہر کی تین چار بسیں یہاں سے گزرا کرتی تھیں۔ رات کو کوئی بس نہیں آتی تھی۔ اگر چوہدری کا بیٹا عقل والا ہے تو وہ لڑکی کو بس سے نہیں لے گیا ہوگا کیونکہ دن کے دوران وہ

لڑکی کو چھپا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ لہٰذہ وہ ریل گاڑی سے گیا ہو گا۔

یہ سب قیاس آرائیاں تھیں۔ تفتیش قیاس آرائیوں اور شکوک پر ہی ہوتی ہے۔ علی رضا ریلوے سٹیشن پر چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا اور اس کا ریلوے سٹیشن بھی چھوٹا سا تھا جہاں صرف دو پسنجر گاڑیاں رُکا کرتی تھیں۔ ایک دن کو اور ایک رات کو۔ رات کی گاڑی میں قصبے کا کوئی کوئی آدمی سفر کیا کرتا تھا۔

علی رضا نے ریلوے سٹیشن پر جا کر بکنگ کلرک کو وہ تاریخ اور دن بتایا جس رات ناصرہ غائب ہوئی تھی۔ ابھی ایک ہی ہفتہ گزرا تھا۔ اُس نے پوچھا کہ رات کی گاڑی سے اُس رات اُس نے کتنے ٹکٹ بیچے تھے۔ اُس نے ریکارڈ دیکھ کر بتایا کہ صرف چھ ٹکٹ دیئے گئے تھے۔ بکنگ کلرک سے پوچھا کہ وہ اِن مسافروں کو پہچانتا ہے؟— اُس نے دو کا نام لیا جنہیں وہ پہچانتا تھا۔ ایک کوئی ہندو تھا اور دوسرا چوہدری کا بیٹا۔ یہ کلرک دو سال سے یہاں تھا۔ وہ چیدہ چیدہ لوگوں کو جانتا پہچانتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ چوہدری کے بیٹے نے لاہور کے دو ٹکٹ لئے تھے۔ کلرک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دوسرا کون تھا۔

علی رضا کو یقین سا ہونے لگا کہ دوسرا ٹکٹ ناصرہ کے لئے تھا۔ اُسے یہ خیال بھی آیا کہ بڑھئی کا فوجی بیٹا لاہور چھاؤنی میں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا — "کیا چوہدری کا بیٹا بڑھئی کے بیٹے کے ایماء پر ناصرہ کو لے گیا ہے اور بھائی نے بہن کو اپنے پاس یا اپنے کسی شادی شُدہ دوست کے فیملی کوارٹر میں رکھ لیا ہے؟"— علی رضا کے اس شک کو بڑھئی کے بیٹے کے خطوط تقویت دے رہے تھے۔ اُس نے امام کے ساتھ ناصرہ کی شادی پر باپ کو بڑے ہی سخت خط لکھے تھے۔

مار کھائی، بیوی نہ بنی

شام کے بعد علی رضا امام کے گھر چلا گیا۔ وہ وَردی میں نہیں تھا۔ امام نے اُس کی منت سماجت کی کہ وہ اُس کی بیوی سے نہ ملے۔ علی رضا نے کہا کہ نہیں ملوں گا۔ صبح وَردی میں دو کانسٹیبل آئیں گے اور آپ کو اور آپ کی بیوی کو تھانے لے جائیں گے۔ امام مجبور ہو گیا۔ علی رضا اُس کی پہلی بیوی کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے اس عورت کی رگوں پر قبضہ کر لیا۔ وہ تو پہلے ہی جلی بیٹھی تھی۔ اُس نے اُن تمام باتوں کی تصدیق کر دی جو علی رضا کو پہلے ہی معلوم ہو چکی تھیں۔

اُس نے کچھ اور باتیں بھی بتائیں۔ اُس نے یقین کے ساتھ بتایا کہ ناصرہ نے امام سے بہت مار کھائی لیکن عملاً اُس کی بیوی نہ بنی۔ پہلی بیوی امام کے خلاف ناصرہ کی حوصلہ افزائی کرتی رہی اور اُس نے کتنی بار ناصرہ کو پٹائی سے بچایا۔ اس عورت نے نئی بات یہ بتائی کہ اُس کے دل میں ناصرہ کی محبت پیدا ہو گئی تھی اور ہمدردی تو بہت تھی۔ ناصرہ نے اُسے ہمراز بنا لیا تھا اور ناصرہ نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ چوہدری کے بیٹے کے سوا کسی اور کو اپنا خاوند تسلیم نہیں کرے گی۔ اُس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے جب موقع ملا، وہ اس لڑکے کے ساتھ چلی جائے گی۔

علی رضا نے اِس عورت کے ساتھ دو گھنٹے صَرف کئے۔ اُسے شک ہونے لگا کہ ناصرہ کے فرار میں اس عورت کی بھی مدد شامل ہے۔ علی رضا ہوشیار اور ذہین آدمی تھا۔ ہر ڈھنگ کھیل سکتا تھا۔ اُس نے اس عورت پر اپنی زبان کا جادو چلایا تو عورت نے اُسے اپنا ہمراز بھائی سمجھ کر بتا دیا کہ جس رات ناصرہ کو گھر سے بھاگنا تھا، اُس رات اس عورت نے امام کو اپنے کمرے میں رکھا تھا۔ اس مقصد کے لئے اُسے بڑے پیار سے کرتب دکھانے پڑے تھے۔ ناصرہ نے اُسے بتایا تھا کہ چوہدری کا بیٹا اُسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہے لیکن اُس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اُسے رکھے

گا کہاں۔

راز کھل کر سامنے آگیا۔ علی رضا وہاں سے ہلکا پھلکا ہو کر نکلا۔ امام کی بیوی نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت کی تھی کہ وہ امام کو پتہ نہ چلنے دے کہ اُس نے یہ باتیں بتاتی ہیں۔ علی رضا نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ ساری عمر امام کو پتہ نہیں چلے گا کہ اس کی پہلی بیوی نے کیا بتایا ہے۔

اُس نے اِس عورت سے یہ بھی کہا تھا ——"تمہارا خاوند اب دوسری شادی کی کبھی سوچے گا بھی نہیں"

پہلی بیوی نے اسے اپنے کمرے میں رکھا

علی رضا واپس اپنے گھر گیا تو چوہدری کا بیٹا آیا بیٹھا تھا۔ علی رضا جب امام کے گھر جا رہا تھا، اُس نے چوہدری کے بیٹے کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر اُس کے گھر آجائے۔ علی رضا نے اُسے کہا کہ وہ کچھ بھی نہ چھپائے تو فائدے میں رہے گا۔ وہ نوجوان تھا۔ بڑی سنگین حرکت کر چکا تھا اور اب وہ ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھا تھا، اس لئے وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے بولنے کی کوشش کی تو ہکلانے لگا۔

"محبت میں تو مرد جانیں قربان کر دیتے ہیں یار!" —— علی رضا نے اُسے دوستانہ بے تکلفی سے کہا —— "تم تو ڈر ہی گئے ہو.... دل مضبوط کرو۔ میں نے تمہیں اپنے گھر بلایا ہے، تھانے میں تو نہیں بلایا اور میں نے تمہیں رات کو بلایا ہے، ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ تمہیں میں نے بلایا ہے۔ تم شاید کچھ بھی نہیں سمجھے"

اُس نے دل مضبوط کر لیا۔ وہ واقعی دلیر تھا۔ اُس نے کہا —— "میں ڈر نہیں رہا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ دوستوں کی طرح مجھ سے بھید لے رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ مجھے اُلٹا لٹکا کر اپنے مطلب کی بات اگلوانے کی کوشش کریں گے.... میں آپ کو صاف لفظوں میں بتا دیتا ہوں کہ آپ

میرے سینے میں سے کوئی بھید نہیں نکال سکیں گے۔ پولیس پہ کون اعتبار کرتا ہے"

اگر علی رضا کی نیت کچھ اور نہ ہوتی تو وہ اُسے واقعی اُلٹا لٹکا دیتا۔ اُس نے ہنس کر اُسے کہا —— "تم خاصے بیوقوف معلوم ہوتے ہو.... مجھے یہ بتا دو کہ تم نے لاہور تک دوسرا ٹکٹ کس کے لئے لیا تھا؟ .... کہہ دو ایک دوست ساتھ گیا تھا۔ اگر ایسے ہی کہو گے تو میں اُس دوست کا نام پتہ بھی پوچھوں گا اور اُسے یہاں بلاؤں گا، پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہارا وہ دوست کون سے کپڑوں میں تھا، وہ کون تھا اور تم نے اُس پر کس طرح پردہ ڈال رکھا تھا.... میرے پاس اتنے گواہ اور اتنا ثبوت موجود ہے کہ میں تمہیں تمہارے گھر سے ہتھکڑی لگا کر لا سکتا اور سیدھا حوالات میں بند کر سکتا تھا۔ اُلو کے پٹھے نہ بنو۔ صاف بتاؤ پھر میری بات سنو۔"

اُس نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا۔

"میں لاہور سے لڑکی کو برآمد کر سکتا ہوں" —— علی رضا نے کہا —— "وہ میں نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے ناصرہ کہاں ہے۔ اپنے منہ سے بولو کہ اُسے تم لے گئے تھے اور امام کی پہلی بیوی نے بڑی چالاکی سے امام کو اُس رات اپنے کمرے میں رکھا تھا"

اُس نے پس و پیش کی۔ علی رضا کی زبان کے جادو اور حوصلہ افزائی سے اُس نے تسلیم کر لیا کہ لڑکی وہی لے گیا تھا اور اُسے لاہور اُس کے بھائی کے حوالے کر آیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ناصرہ کا بھائی اس قدر غصے میں ہے کہ وہ امام کو، چوہدری کو اور اپنے باپ کو بھی قتل کرنے کے لئے تیار تھا۔ بہن بھائی کی آپس میں بہت محبت تھی۔ اُس کے بھائی نے یہ پروگرام بنا رکھا تھا کہ وہ رات کو یہاں آئے گا، امام اور چوہدری کو قتل کر کے اور اپنی بہن کو ساتھ لے کر اُسی رات واپس لاہور چھاؤنی چلا جائے گا۔ اُس رات کی وہ کوئی ڈیوٹی لکھوا لے گا اور اگر پولیس نے شک کیا تو وہ ثابت کر دے گا کہ وہ وقوعہ کی رات لاہور رات کی ڈیوٹی پہ تھا۔

یہ غصّے اور انتقام کے تحت بنی ہوئی سکیم تھی۔ ناصرہ کے بھائی نے یہاں تک تو ٹھیک سوچا تھا کہ وہ رات کو قتل کی واردات کر کے واپس اپنی یونٹ میں چلا جاتے گا۔ ایسی کچھ وارداتیں ہوئی بھی تھیں۔ فوجی رات کو آیا اور اپنے دشمن کو قتل کر کے چلا گیا۔ اگر وہ گرفتار ہو بھی گیا تو ثبوت اور شہادت کے باوجود وہ بری ہو گیا کیونکہ اُس کی یونٹ نے تحریری ثبوت پیش کر دیا کہ وقوعہ کی رات وہ ڈیوٹی پر تھا، مگر ناصرہ کے بھائی کا مسئلہ قتل پر ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ناصرہ کو کب تک کسی دوست کے گھر چھپاتے رکھتا۔ اگر کسی کے ساتھ اُس کی شادی کرتا تو امام سے طلاق لینی ضروری تھی۔

ساری عمر کے سجدے مظلوم کی آہ

چوہدری کا بیٹا علی رضا کے ساتھ کھُل گیا تھا۔ اُس نے ناصرہ کی محبّت کی وہی باتیں سنائیں جو پہلے معلوم ہو چکی تھیں۔ اُس نے اپنے خون سے قسم کھائی تھی کہ شادی ناصرہ سے ہی کرے گا۔ اُس نے علی رضا کو محبّت کی ساری روئیداد سُنا دی۔ ناصرہ کی شادی ایسے طریقے سے کر دی گئی کہ چوہدری کا بیٹا کچھ بھی نہ کر سکا۔ اپنے باپ کے ساتھ اُس کی دشمنی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ اپنے باپ کے خلاف اُس کے دل میں اُسی وقت نفرت پیدا ہو گئی تھی جب چوہدری نے بڑھئی کو کام سے جواب دے دیا تھا اور اُس کی بے عزّتی کی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھے۔

وہ ناصرہ سے شادی کے بعد بھی ملتا رہا۔ اُسے ناصرہ نے اور اُس کے باپ نے بتایا تھا کہ ناصرہ کا بھائی بھی اس شادی پہ سخت بھڑکا ہوُا ہے اور وہ امام سے ناصرہ کی طلاق تک لینے کو اور اُسے قتل کر دینے کو بھی تیار رہے۔ ناصرہ نے چوہدری کے بیٹے سے کہا کہ وہ اُس کے بھائی سے ملے اور اُسے کہے کہ وہ ناصرہ کے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہے اور ناصرہ

امام کے گھر سے بھاگنے کو تیار ہے۔

چوہدری کا بیٹا لاہور چلا گیا اور ناصرہ کے بھائی سے ملا۔ اپنے باپ کے خلاف باتیں کیں۔ یہ بھی کہا کہ وہ اپنے باپ سے جائیداد اور کاروبار کا حصّہ لے کر اُس سے صرف ناصرہ کی خاطر الگ ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ اُس نے ناصرہ کے بھائی کو یقین دلا دیا کہ وہ ہر طرح اُس کے ساتھ ہے، ناصرہ کو امام کے گھر سے نکال لاتے گا اور جہاں کہیں اُسے رکھنا پڑا رکھے گا۔ ناصرہ کے بھائی کو اُس پر اعتبار آ گیا۔ وہ تو پہلے ہی بھڑکا ہوُا تھا۔ اُس کا خون تو یہ سوچ سوچ کر کھولتا رہتا تھا کہ امام اور چوہدری نے اُس کے باپ کو مارا پیٹا اور اُس کی بہن کو ہر روز مارتا پیٹتا ہے کیونکہ اُس کی بہن امام کو خاوند تسلیم نہیں کرتی۔ یہ سُن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔

چوہدری کے بیٹے نے اُسے کہا کہ کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔ قتل بھی کیا جا سکتا ہے لیکن پکڑے گئے تو ناصرہ اور اُس کے ماں باپ کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہو گا۔ ماں باپ بوڑھے ہیں۔ کب تک زندہ رہیں گے۔ ناصرہ ذلیل و خوار ہو جاتے گی۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ ناصرہ کو وہاں سے نکال کر لاہور لایا جاتے۔ چوہدری کا بیٹا اپنے باپ سے حصّہ الگ کر کے اپنا کاروبار کرے گا اور ناصرہ کے ساتھ شادی کر لے گا۔

ناصرہ کے بھائی نے کہا کہ ناصرہ کو تھوڑے دنوں کے لئے لاہور میں رکھنے کا انتظام ہو جاتے گا۔ بہرحال یہ طے ہو گیا کہ چوہدری کا بیٹا ناصرہ کو نکال لاتے۔ وہ واپس آ گیا۔ اُس نے عقلمندی یہ کی کہ فوراً ہی ناصرہ کو نکالنے کی کوشش نہ کی۔ ناصرہ کسی بھی رات امام کے گھر سے بھاگ جانے کو تیار تھی۔

چوہدری کے بیٹے نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے باپ کے پیچھے پڑ گیا کہ جائیداد سے اُس کا حصّہ الگ کر دے اور اُسے الگ دکان دے۔ وہ اپنی آزاد پوزیشن بنا رہا تھا۔

باپ نے اُسے ٹالنے اور سمجھانے بجھانے کی جتنی کوشش کی بیٹا اتنا ہی زیادہ بھڑکتا گیا۔ اُس نے گھر کے تمام افراد کو بتایا کہ اُس

کے باپ نے ایک غریب اور بے کس آدمی کو مار پیٹ کر اُس کی بیٹی کو زبردستی اُس کے باپ کی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا ہے، اور یہ ایسا گناہ ہے جس کی سزا خدا کی طرف سے سارے خاندان کو ملے گی۔

اُس نے ایسی باتیں کیں کہ گھر کے تمام افراد اُس کے حامی اور چوہدری کے خلاف ہو گئے۔ ان میں چوہدری کی دبنگ قسم کی بیوی بھی تھی، اس کے دو بیٹے اور ایک شادی شدہ بہن بھی تھی۔ اس کا داماد بھی اُس سے کھچا کھچا رہنے لگا۔

علی رضا نے مجھے چوہدری کے بیٹے کے یہ الفاظ سنائے جو اُس نے اپنے باپ سے کہے تھے۔ یہ مجھے آج تک یاد ہیں — "آپ کے ساری عمر کے سجدوں میں اتنی طاقت نہیں جتنی غریب اور مظلوم کی ایک آہ میں ہوتی ہے۔ دولت کی چمک سے آپ خدا کی آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ خدا گناہگار کی نمازوں کے دھوکے میں نہیں آیا کرتا۔"

چوہدری مجبور ہو گیا کہ بیٹے کو حصّہ دے کر الگ کر دے۔ چوہدری کے بیٹے نے علی رضا کو بتایا کہ اُس کا باپ صرف باتوں سے اُسے حصّہ دینے پر رضامند نہیں ہُوا تھا۔ اُس نے ایک روز باپ کو چاقو دکھا کر بڑے تحمّل سے کہا تھا — "اگر آپ نے میرا حصّہ الگ نہ کیا تو میں پھر بھی آپ سے الگ ہو جاؤں گا لیکن آپ کو زندہ نہیں رہنے دوں گا۔"

باپ نے بیٹے کے حِصّے کی علیحدگی کی کاغذی کارروائی مکمل کر لی اور یہ بھی طے کر لیا کہ کاروبار میں سے اُسے کتنی نقد رقم دے گا۔ ادھر سے مطمئن ہو کر چوہدری کے بیٹے نے ناصرہ سے ملاقات کی اور اُسے کہا کہ وہ کل رات فلاں جگہ آجائے۔ ناصرہ اپنا زیور امام کے گھر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ زیور ماں باپ کو دے آئی لیکن باپ ڈر کے مارے زیور امام کو دے آیا۔ نہ باپ کو معلوم تھا نہ امام کو شک تھا کہ ناصرہ بھاگ رہی ہے۔ چوہدری کے بیٹے کو معلوم تھا کہ امام کی پہلی بیوی ناصرہ کو فرار میں مدد دے رہی ہے۔

اُن کی سکیم کامیاب رہی۔ ناصرہ امام کے گھر سے نکل آئی۔ چوہدری کا بیٹا انتظار میں کھڑا تھا۔ ناصرہ نے اپنے اوپر ایک کمبل ڈال رکھا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر گئے۔ چوہدری کے بیٹے نے لاہور کے دو ٹکٹ لئے پلیٹ فارم پر روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ گاڑی آئی اور دونوں کو لاہور لے گئی۔ وہ ناصرہ کو اُس کے بھائی کے حوالے کر کے اُس وقت واپس آیا جب بھائی نے ناصرہ کو رکھنے کا انتظام اپنے ایک دوست کے فیملی کوارٹر میں کر دیا۔

علی رضا نے اُس سے پوچھا کہ اب وہ کیا کرے گا۔ اُس نے کہا کہ باپ سے اپنا حصّہ لے کر یہاں یا کہیں اور کاروبار شروع کرے گا اور ناصرہ کے ساتھ شادی کر لے گا۔ علی رضا نے اُسے کہا کہ اُسے شاید معلوم نہیں کہ امام سے طلاق لئے بغیر وہ ناصرہ کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔

تب وہ چونکا اور آہستہ سے بولا — "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"میں تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں" — علی رضا نے اُسے کہا — "میں تمہیں دو دِنوں کی مہلت دیتا ہوں۔ کل اور پرسوں۔ اس سے اگلے دن امام سے ناصرہ کا تحریری طلاق نامہ لے آؤ۔ اگر نہ لا سکے تو مجھے باضابطہ کارروائی کرنی پڑے گی۔ اس کام کے لئے میں تمہیں آزاد چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم نے مفرور ہونے کی کوشش کی تو تمہاری زندگی جہنم بن جائے گی.... جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔

خُدا کا خنجر

علی رضا نے مجھے سنایا — "اگلا دن گزر گیا۔ اگلی رات بھی گزر گئی۔ اس سے اگلے دن کی صبح طلوع ہوئی تو میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ابھی جاگا نہیں تھا۔ میری بیوی نے مجھے جگا کر بتایا کہ ہٹا کٹا مولوی سا آیا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہمارے امام صاحب ہوں گے۔ میں

گھبرا گیا۔ گھبراہٹ کی ایک وجہ تھی جو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ میں ایک خبر کا منتظر تھا۔ یہ میرے لئے اچھی ہو سکتی تھی اور بہت بُری بھی۔ میں بہت تیز چلتا باہر نکلا۔ امام کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیسے آیا ہے۔ اُس نے کہا — 'میں اپنا مقدمہ واپس لینا چاہتا ہوں' — میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے کہا — 'میں نے اُس بدکارہ اور فاحشہ کو طلاق دے دی ہے' — میری گھبراہٹ ختم ہو گئی۔"

علی رضا نے اُسے اندر بٹھایا اور کہا کہ اُسے تحریری طلاق نامہ تھانے میں دینا ہو گا جو کیس کی فائل میں لگایا جائے گا، ورنہ علی رضا سے باز پُرس ہو سکتی ہے کہ اُس نے کیس کیوں ختم کر دیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ علی رضا نے کیس رجسٹر ہی نہیں کیا تھا اور اس کی کوئی فائل نہیں کھُلی تھی۔ امام نے کہا کہ اُس نے طلاق نامہ دے دیا ہے۔ اُس کے باپ تک پہنچ گیا ہو گا۔

علی رضا نے اُس سے ایک بیان اس قسم کا لکھوا لیا کہ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ اُس کی بیوی اُس کی رضا اور اجازت سے گئی ہے۔ وہ اپنے ساتھ وہی زیور لے گئی ہے جو وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے لائی تھی۔ اُس نے امام کے گھر سے کوئی چوری نہیں کی اور امام نے اُسے ساڑھے تین سو روپیہ حق مہر دے دیا ہے۔

امام کے جانے کے نصف گھنٹہ بعد چوہدری کا بیٹا آ گیا۔ اُس نے امام کے ہاتھ کی لکھی ہوئی طلاق علی رضا کے آگے رکھ دی۔ اگر امام پہلے آ کر بتا نہ گیا ہوتا تو علی رضا یقین نہ کرتا کہ امام نے ناصرہ کو طلاق دے دی ہے۔ اُس نے امام سے جو بیان لکھوایا تھا، وہ تحریر طلاق کی تحریر سے ملائی۔ دونوں تحریریں ایک ہاتھ کی لکھی ہُوئی تھیں۔ علی رضا نے چوہدری کے بیٹے کو بہت کچھ سمجھا بجھا کر رخصت کیا۔ اُس نے چونکہ کیس رجسٹر ہی نہیں کیا تھا اس لئے اُس کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہی نہ ہُوا کہ وہ کیس پر پردہ کس طرح ڈالے۔

اُس نے بتایا کہ تھوڑے عرصے بعد پتہ چلا کہ چوہدری کا بیٹا ناصرہ کو بیاہ لے آیا ہے۔ اُن کی باقاعدہ شادی ہو چکی تھی۔ بیٹا باپ سے الگ ہو گیا — "اور ایک رات میاں بیوی میرے گھر آ گئے۔ میں نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کسی غریب بڑھئی کی بیٹی ہے۔ بہت خوبصورت ہے" — علی رضا نے کہا — "اس کے باپ نے ٹھیک کہا تھا کہ خدا غریب کو بیٹی نہ دے۔ بیٹی ہی دینی ہے تو اتنی خوبصورت نہ دے.... دونوں میرا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔"

علی رضا کی کہانی یہاں ختم ہو گئی۔ اس واقعہ کو ابھی صرف چھ مہینے گزرے تھے۔ علی رضا کو خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے جانے کے بعد چوہدری یا امام یا اُن کا کوئی ساتھی اُس کے خلاف شکایت یا کوئی کارروائی نہ کر دیں۔ میں نے اُسے تسلّی دی کہ اُس نے جو کچھ کیا ہے وہ ضابطے اور قانون کے خلاف کیا ہے، لیکن ایسے طریقے سے کیا ہے کہ اُسے کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اُس نے یہ کام اچھی نیّت سے کیا ہے اس لئے خُدا اُس کی عزّت کی حفاظت کرے گا۔

میں نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا کہ اُس کی غیر حاضری میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونے دوں گا۔ اسی کیس کی باتیں کرتے ہُوئے میں نے کہا کہ امام بڑا ہی کچا نکلا کہ اُس نے لڑکی کو طلاق دے دی۔ میرا خیال ہے کہ اُس نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ کسی نے اُسے مشورہ دیا ہو گا کہ تھانے اور عدالت میں اُس کی رسوائی ہو گی۔

"یہ بھی بتا دوں کہ اُس نے طلاق کیوں دی تھی؟" — علی رضا نے مُسکراتے ہُوئے کہا — "ملک! مجھے ذلیل تو نہیں کراؤ گے؟"

"اصل راز تو یہ معلوم ہوتا ہے جو تم مجھ سے چھپانا چاہتے تھے" — میں نے کہا — "یہ نہیں بتاؤ گے تو میں، اگر ضرورت پڑی تو تمہیں ذلّت سے کس طرح بچاؤں گا؟"

"یہ تو تم نے دیکھ لیا ہے نا کہ امام نے مذہب کی امامت کے زور پر

اور چوہدری نے دولت اور اونچی حیثیت کے رعب میں ایک غریب آدمی پر کیا ظلم کیا ہے اور اس کی بیٹی کا نکاح زبردستی پڑھا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ اسے مارتے پیٹتے رہے، کیونکہ دونوں کو یہ گھمنڈ تھا کہ ان کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں۔ چوہدری کا بیٹا اس غریب بڑھئی کی لڑکی کو چاہنے لگا تو چوہدری نے اس کی سزا بڑھئی کو بے روزگار کر کے دی۔ امام اور چوہدری بھول گئے تھے کہ ظالم کا ہاتھ روکنے والا موجود ہے لیکن وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ وہ خدا ہے اور یہ خدا کا ہی حکم تھا کہ میں اس کی ذاتِ باری کی وہ لاٹھی بنوں جس کی آواز نہیں ہوتی۔ ملک! تم جانتے ہو۔"

میں بے تاب ہو رہا تھا کہ وہ مجھے جلدی جلدی وہ بات بتائے جو اس نے چھپالی تھی۔ میں نے کہا — "وعظ بند کرو اور اصل بات پر آؤ۔"

"ملک یار!" — اس نے کہا — "بات یہ ہے کہ امام سے طلاق لکھوانے کا بندوبست میں نے ہی کیا تھا۔"

"یہ تو تم بتا چکے ہو کہ تم نے چوہدری کے بیٹے سے کہا تھا کہ امام سے طلاق لکھوا لاؤ۔" — میں نے کہا — "اور وہ لکھوا لایا۔ وہ روپے پیسے والا تھا۔ اس نے امام کے آگے رقم رکھ کر کہا ہوگا کہ طلاق لکھ دو اور یہ رقم اٹھا لو۔"

"ارے نہیں ملک!" — اس نے کہا — "اس طرح تم اتنی خوبصورت اور نوجوان بیوی کو طلاق دے دو گے؟ .... سنو! .... امام نے ایک خنجر اور ایک چاقو کی نوک پر طلاق لکھی تھی اور یہ میرا بندوبست تھا۔ میں نے چوہدری کے بیٹے سے کہا کہ ایک یا دو قابلِ اعتماد دوستوں کو ساتھ لو اور رات کے وقت امام کے گھر کی دیوار پھاند کر اندر جاؤ۔ اسے جگاؤ اور چاقو کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ کر طلاق لکھوا لو۔"

میں حیرت سے علی رضا کا منہ دیکھ رہا تھا — "چوہدری کا بیٹا میرے پاس طلاق نامہ لے کر آیا تھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ رات کو میرے گھر سے اٹھ کر ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ لاہور کی طرف جانے والی

پسنجر ٹرین آنے والی تھی۔ اس سے لاہور گیا۔ ناصرہ کے بھائی سے بات کی۔ میرا حوالہ دیا۔ اگلی رات جو پسنجر ٹرین لاہور سے آتی ہے، اس سے دونوں آئے۔ سٹیشن سے سیدھے امام کے گھر گئے۔ اس کی دیوار پھاند گئے۔ امام اور اس کی بیوی ایک کمرے میں سوتے تھے۔ انہوں نے امام کو جگایا۔ ناصرہ کے بھائی کے پاس خنجر تھا اور چوہدری کے بیٹے کے پاس لمبا چاقو اور ٹارچ تھی ....

"انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں امام کے ایک پہلو میں خنجر کی نوک اور دوسرے پہلو میں چاقو کی نوک رکھ کر کہا — 'طلاق لکھ دو' — انہوں نے اسے یہ بھی کہا کہ طلاق نہیں لکھو گے تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور اگر طلاق لکھ کر کل تھانے رپورٹ کرنے گئے تو یاد رکھو درجنوں گواہ گواہی دیں گے کہ تم نے ناصرہ کے ماں باپ کو مار پیٹ کر اس کے ساتھ جبراً نکاح پڑھایا ہے۔ ہم تمہیں پانچ سال سزا دلائیں گے ....

"میں نے امام کو پہلے ہی ڈرا رکھا تھا کہ اس نے بڑھئی کو زدوکوب کرنے کا جو جرم کیا ہے اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔ اب اس نے اپنی جان ایک خنجر اور ایک چاقو کی نوک پر دیکھی تو اس نے طلاق لکھ دی۔ چوہدری کے بیٹے نے کہا کہ ناصرہ کا وہ زیور نکالو جو اسے ماں باپ نے دیا تھا۔ اس نے وہ نکال دیا۔ ناصرہ کے بھائی نے کہا کہ حق مہر ادا کرو۔ یہ چھ سو روپے تھا۔ امام نے منت کے لہجے میں کہا کہ اس کے پاس اتنی رقم نہیں۔ اس نے ایک ٹرنک سے رقم نکالی۔ یہ ساڑھے تین سو روپے تھی۔ اس سے وہی لے لی گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ امام کی پہلی بیوی امام کو کہتی رہی کہ لکھ دو طلاق، اور یہ جو مانگتے ہیں ان کے حوالے کر دو۔ کس طوائف کو بیاہ لائے تھے جس نے ہمارے پیچھے غنڈے اور ڈاکو ڈال دیتے ہیں .... وہ تو چاہتی ہی یہی تھی، اور وہ جو چاہتی تھی، وہ ہو گیا۔ ناصرہ کا بھائی زیور اور رقم لے کر لاہور چلا گیا۔ چوہدری کا بیٹا یہیں رہ گیا۔"

علی رضا نے یہ کہانی سنانے سے پہلے مجھے کہا تھا کہ اس کے چلے

جانے کے بعد اُس کے خلاف کوئی طوفان نہ اُٹھ کھڑا ہو۔ وہ اگلے روز چلا گیا۔ میں اس تھانے میں ڈیڑھ سال رہا۔ کوئی طوفان نہ اُٹھا۔



بہن جو بدنام ہوئی

اغوا اور قتل جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کے ارتکاب کے لئے ایک خاص قسم کی ذہانت اور فہم و فراست کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صرف جرائم پیشہ لوگوں، بلکہ اُن کے استادوں میں پائی جاتی ہے۔ جُرم تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ کسی کو قتل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل استادی یہ ہوتی ہے کہ آپ پکڑے نہ جائیں، کوئی سراغ نہ چھوڑیں، مگر ہر کسی کے لئے یہ ممکن نہیں۔ سنگین جرائم کا ارتکاب جب جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی عام آدمی کرتا ہے تو اس کے پس منظر میں ایک کہانی ہوتی ہے۔ وہ ہزار کوشش کرے، لاشعوری طور پر سراغ چھوڑ جاتا ہے۔ وہ جب پکڑا جاتا ہے تو جرم کے پس منظر کی کہانی سنسنی خیز اور عبرت ناک ڈرامہ بن جاتی ہے۔

واردات جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں، اناڑیوں نے جذبات اور اشتعال کے زیرِ اثر کی تھی، پھر اس میں انتقامی طور پر بھی ایک واردات شامل ہو گئی اور یہ ایک ناقابلِ فراموش ڈرامائی کہانی بن گئی۔

وہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ میں اس کے تھانے کا انچارج تھا۔ ایک شادی شُدہ جوان آدمی لاپتہ ہو گیا۔ وہ اپنے ماں باپ سے الگ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اُن کا ایک دودھ پیتا بچّہ تھا۔ تھانے میں لاپتہ آدمی کا باپ اور محلّے کے دو آدمی رپورٹ دینے آئے تھے۔ لاپتہ آدمی کا نام نصیر تھا۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ وہ ایک گاؤں

جاتے گا اور دوپہر تک واپس آکر دکان کھولے گا۔ اُس کا کاروبار لکڑی کے فرنیچر کا تھا۔ وہ فرنیچر دو کاریگروں سے بنوا کر دکان میں رکھا کرتا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو اُس گاؤں کا نام نہیں بتایا تھا جہاں اُسے جانا تھا۔

وہ واپس نہ آیا۔ رات کو بھی نہ آیا۔ اگلا دن بھی گزر گیا، پھر رات بھی گزر گئی۔ دو دن اور گزر گئے تو یہ لوگ تھانے میں آگئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ پہلے بھی کبھی اس طرح گیا ہے کہ جلدی آنے کا کہہ گیا ہو اور زیادہ دنوں بعد آیا ہو؟ نصیر کے باپ نے بتایا کہ کبھی کبھی وہ دیہاتی علاقے میں شیشم کے درخت خریدنے کے لئے جایا کرتا ہے۔ اس کام میں اُسے زیادہ سے زیادہ دو دن لگا کرتے تھے۔ درخت خریدنے کا سلسلہ یوں تھا کہ لکڑی کا فرنیچر، چارپائیوں اور پلنگوں کے پائے بنانے والے لوگ دیہات میں جا کر کھڑے درخت خریدا کرتے تھے۔ یہ درخت دیہاتیوں کی ذاتی ملکیت ہوتے تھے۔ جس کھیت میں درخت ہو وہ کھیت والے کا ہوتا تھا۔ ایک آدمی ایک وقت میں دو یا تین درخت خریدا کرتا تھا۔ دیہات میں درخت کاٹنے والے آدمی مل جاتے تھے۔ ان کے تنے اور ٹہن موزوں ٹکڑوں میں کاٹ کر بیل گاڑیوں پر لاد دیتے تھے۔

میں نصیر کی گمشدگی کی رپورٹ پر کچھ حیران ہُوا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ لاپتہ ہو جانے والے فرد کو لوگ پہلے خود تلاش کرتے ہیں اور کئی دن ضائع کر کے پولیس کو رپورٹ دیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر نصیر دیہات میں درخت خریدنے کے لئے اکثر جاتا رہتا تھا اور دو تین دن واپس نہیں آتا تھا تو اُنہوں نے اب کیوں فرض کر لیا ہے کہ وہ لاپتہ ہے۔ میں نے اُن سے اس ضمن میں بات کی تو اُنہوں نے زیادہ انتظار نہ کرنے کی یہ وجہ بتائی کہ نصیر بیوی سے کہہ گیا تھا کہ گاؤں جا رہا ہوں، دوپہر تک آجاؤں گا اور باقی دن دکان میں بیٹھوں گا۔ اُنہوں نے یہ وجہ بھی بتائی کہ چھ سات ماہ پہلے ایک آدمی لاپتہ ہو گیا تھا۔ گھر والے

اپنے طور پر اُسے ڈھونڈتے رہے تھے اور انہوں نے پندرہ دنوں بعد تھانے میں رپورٹ درج کرائی تھی۔ اُس وقت تک گمشدہ آدمی کی لاش کی صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں ـــــ یہ تفتیش بھی میں نے ہی کی تھی اور میں نے ہی کہا تھا کہ اگر اس آدمی کی گمشدگی کی رپورٹ جلدی مل جاتی تو شاید میں اسے قتل ہونے سے پہلے ہی ڈھونڈ نکالتا۔

میں اُن کے جواب سے مطمئن نہ ہُوا۔ ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ مجھے شک ہونے لگا کہ یہ کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہیں جس میں نصیر گھِر گیا ہے۔ یہ ان لوگوں کی حماقت تھی کہ مجھ سے کچھ چھپا رہے تھے۔

میں نے آخر تنگ آکر انہیں کہا کہ تم لوگ ڈاکٹر یا تھانیدار سے کچھ چھپاؤ گے تو اپنا نقصان کرو گے، اور جب تک اپنے تمام شکوک میرے آگے نہیں رکھو گے میں کچھ نہیں سمجھ سکوں گا اور میں اس بناء پر رپورٹ رجسٹر نہیں کروں گا کہ نصیر کاروبار کے سلسلے میں گیا ہے، جوان آدمی ہے، واپس آجائے گا۔

دونوں آدمیوں نے نصیر کے باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے سر جھکا لیا۔ دونوں آدمیوں نے اُسے کہا کہ اپنا شک بتا دو۔ باپ اَن پڑھ آدمی تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُس کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ اُس کی بہو یا بیٹی کا بھی کچھ تعلق ہے جسے بیان کرنے سے یہ جھجک رہا ہے۔

مُنہ بولے بہن بھائی، مگر...

"میرے بیٹے (نصیر) کی عمر کا ایک آدمی ہے، مجھے اُس پر شک ہے" ـــ باپ نے رُک رُک کر کہا ـــ "اُس نے میرے بیٹے کو غائب کر دیا ہے۔"

میں نے اُسے کہا کہ پوری بات سناؤ اور کھل کر سناؤ۔ وہ آدمی کون

ہے اور اُس نے نصیر کو کیوں غائب کیا ہے؟ ساری بات سناؤ۔

بات یہ سامنے آئی کہ راجپوت خاندان کا ایک جوان آدمی جس کا نام نادر علی تھا، نصیر کی بیوی کا منہ بولا بھائی بنا ہُوا تھا۔ نصیر کی بیوی بھی اُسے اپنا بھائی کہا کرتی تھی۔ نادر علی نصیر کی موجودگی میں بھی ان کے گھر بیٹھا رہتا تھا اور نصیر کی غیر حاضری میں بھی وہاں جاتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو بہن بھائی کہتے تھے لیکن لوگوں کے مُنہ پر کون ہاتھ رکھ سکتا ہے۔ لوگ کُھسر پُھسر کرتے تھے کہ ان کے تعلقات بہن بھائی والے نہیں ہیں۔

یہاں میں آپ کو ایک خاص بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اُس وقت جب ہمارا معاشرہ مغربی تہذیب اور فیشن سے پاک تھا، مُنہ بولے بہن بھائی کا رواج عام تھا۔ بعض جوان لڑکے اور لڑکیاں جن کا آپس میں خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا تھا، ایک دوسرے کو بہن بھائی کہہ کر سگے بہن بھائیوں جیسا انداز اختیار کر لیتے تھے اور ثابت کر دیتے تھے کہ اُن کی محبت بہن بھائی والی ہے۔ اب تو مُنہ بولے بہن بھائی کا تصوّر ختم ہی ہو چکا ہے۔ نئی تہذیب ہمیں اس اخلاقی پستی تک لے آئی ہے کہ بعض مغرب زدہ امیر زادے اپنی بہنوں کا تعارف اپنے دوستوں سے کراتے اور بہنوں کا تبادلہ کر لیا کرتے ہیں۔

نصیر کی بیوی اور نادر علی بھی مُنہ بولے بہن بھائی تھے لیکن ان لوگوں کو اُن پر شک تھا۔ میں نے نصیر کے باپ پر اور اُس کے ساتھ کے دونوں آدمیوں پر بہت جرح کی۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ انہیں صرف شک ہے یا ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت ہے۔ میں ان کی باتوں سے یہ سمجھا کہ اُن کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ انہیں کچھ اور لوگوں نے بھی مشورہ دیا تھا کہ انسان کا کچھ بھروسہ نہیں، پولیس کو اطلاع دے دو۔

میں نے جب نادر علی کے متعلق پوچھا تو مجھے بھی شک ہونے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ نادر علی امیر زمیندار کا بیٹا ہے۔ اُس کے باپ کی بہت ساری زمین ہے اور نادر علی تین بہنوں کا اکیلا بھائی ہے اور اُس کا باپ مر چکا ہے۔ خود سَر اور دلیر ہے۔ اُس کی شادی ہوئی تھی۔ بیوی صرف ایک سال بعد مر گئی۔ اُسے مرے دو سال گزر گئے ہیں مگر نادر علی نے دوسری شادی نہیں کی۔ اُس نے ماں بہنوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔

دو سال گزر گئے تھے۔ جب اُس کی بیوی زندہ تھی، اُس وقت بھی اُس نے نصیر کی بیوی کو بہن بنا رکھا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد نصیر کے گھر زیادہ جانے لگا۔ دونوں عیدوں پر وہ سب کے سامنے نصیر کی بیوی کے لئے کپڑوں کا جوڑا لے جایا کرتا تھا۔ نصیر نے (اُس کے باپ کے کہنے کے مطابق) نادر علی کے اپنے گھر آنے جانے پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا، بلکہ اُن کی آپس میں گہری دوستی تھی۔

ایسی اور بھی کئی ایک تفصیلات معلوم کر کے مجھے بھی شک ہونے لگا کہ نادر علی بہن بھائی کے رشتے کو پردے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ مجھے نادر علی اور نصیر کی بیوی کے درمیان کوئی مشترک چیز نظر نہیں آتی تھی۔ نادر علی راجپوت تھا، امیر زادہ تھا اور لاڈ پیار سے بگڑا ہُوا۔ نصیر کی بیوی غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ نصیر کے گھر وہ خوشحال تھی لیکن یہ درمیانہ درجے کا گھرانہ تھا۔ نصیر نے اپنے آپ کو مُغل کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ زمانہ ذات پات کا سخت پابند تھا۔ مزدور کلاس کی لڑکی کے ساتھ اُونچی ذات کے امیر زادے کے تعلقات ناجائز ہو سکتے تھے اور ہوتے بھی تھے، بہن بھائی والا پیار نہیں ہو سکتا تھا۔

نصیر کا باپ اور اُس کے ساتھ آئے ہُوئے آدمیوں نے اس شک کا اظہار بھی کیا کہ نصیر جب درختوں کی خریداری کے لئے جایا کرتا ہے تو اُس کے پاس خاصی رقم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کسی نے رقم کے لالچ میں اُسے قتل کر دیا ہو، لیکن وہ زیادہ تر شک نادر علی پر کر رہے تھے۔

انسان حیوان بن جاتا ہے

"کیا آپ لوگ مجھے بتا سکتے ہیں کہ نصیر جس روز گھر سے گیا، اُس روز نادر علی بھی کہیں چلا گیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"ہم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ وہ اُس روز شہر سے باہر چلا گیا تھا" — ان تینوں میں سے ایک نے کہا — "وہ پرسوں غائب ہُوا ہے۔ ہُوا یُوں کہ ہم نے دو معزّز آدمی ساتھ لئے اور نادر علی کے گھر گئے۔ اُسے بتایا کہ نصیر گھر سے غائب ہے۔ اُس نے ہمیں تسلّی دی کہ وہ بچّہ تو نہیں، آجائے گا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ہماری بات توجہ سے نہیں سُن رہا تھا، ٹال مٹول کر رہا تھا۔ آخر ایک معزّز بزرگ نے اُسے کہا کہ دیکھو بیٹا! یہ بات ٹھیک نہیں۔ تمہارا باپ بڑا شریف اور عزّت دار آدمی تھا۔ ہمیں در پردہ بتا دو۔ ہم پولیس کو نہیں بتائیں گے .... وہ حیران سا ہو کے ہم سب کو دیکھنے لگا۔ بزرگ نے اور صاف الفاظ میں کہا کہ تم نے نصیر کی بیوی کی خاطر نصیر کو غائب کر دیا ہے۔ اپنی ذات کی عزّت رکھو .... وہ غصّے میں آگیا۔ کہنے لگا کہ تم لوگ مجھ پر اُس عورت کے متعلق شک کر رہے ہیں جو میری بہن ہے؟ تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں اس عورت کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں اس لئے میں نے اس کے خاوند کو غائب کر دیا ہے ....

"دوسرے بزرگ نے کہا کہ ہم یہی کہہ رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بہت امیر کبیر ہو مگر ہم تمہاری برادری کے بزرگ ہیں۔ ہم اپنی برادری اور اپنی ذات کو رُسوا نہیں ہونے دیں گے۔ راجپوت برادری کے سب لوگ تمہیں شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اگر نہیں مانو گے تو یہ لوگ پولیس میں تمہارا نام مشتبہوں میں لکھوا دیں گے .... نادر علی اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا کہ مجھے معلوم ہے کہ نصیر کون کون سے گاؤں جایا کرتا ہے۔ میں اُس کے پیچھے جا رہا ہوں اور اُسے لے کے واپس آؤں گا .... یہ کہہ کر

وہ گھر سے نکل گیا۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

یہ تینوں آدمی ذہین معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان پر تھانے کا ڈر بھی سوار تھا اور جوان آدمی کا لاپتہ ہو جانا بھی ان کے لئے بہت بڑا حادثہ تھا۔ میری ضرورت یہ تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل فراہم کرتے مگر وہ تو جیسے اس کوشش میں تھے کہ جو کچھ بھی مجھ سے چھپا سکتے ہیں چھپا لیں، میرے فرائض ایسے تھے کہ میں انہیں ٹال نہیں سکتا تھا، حالانکہ ٹالنے بلکہ جان چھڑانے کا جواز موجود تھا۔ اُنہوں نے جب نادر علی کی بات سُنائی اور بتایا کہ وہ کہیں چلا گیا ہے تو میں نے ذہن میں یہ شک نوٹ کر لیا تھا کہ یہ شخص اس واردات میں ملوّث ہے۔ اسے امید ہو گی کہ نصیر کو غائب کرنے کا شک اس پر نہیں کیا جائے گا، مگر اس کی برادری کے بزرگوں نے اسی کو جا پکڑا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کا نام مشتبہوں میں لکھوا دیا جائے گا۔

نادر علی عادی مجرم تو تھا نہیں کہ وہ جرم کے بعد کی بھی سوچ سکتا۔ اُس نے جب دیکھا کہ سب سے پہلا شک اُسی پر کیا گیا ہے تو وہ یہ کہہ کر بھاگ نکلا کہ وہ نصیر کو لے کر واپس آئے گا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اُس نے جوانی کی عمر میں دوسری شادی نہیں کی تھی، وہ نصیر کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے نصیر کو راستے سے ہٹانے کے لئے اُسے غائب کر دیا ہو گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نصیر کی بیوی بھی اُس کے جرم میں شامل ہو۔ اگر نادر علی باقاعدہ پلان کے تحت بھاگا تھا تو نصیر کی بیوی کو بھی نادر علی کے پیچھے گھر سے غائب ہونا اور اس سے جا ملنا تھا۔

یہ میری قیاس آرائیاں تھیں۔ اگر ان دونوں نے یہی سکیم بنائی تھی تو یہ اُن کی بہت بڑی حماقت تھی۔ انہیں گرفتار ہونا اور سزا پانا تھا۔

یہ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جنسیّت ایسا جذبہ ہے جو انسان کو پاگل کر دیتا ہے۔ انسان حیوان بن جاتا اور عقل سے محروم ہو جاتا ہے۔ حیوان ایک مادہ پر ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ یہی حال انسان کا ہو

جاتا ہے۔ مجھے شک ہونے لگا کہ یہی حال نصیر کی بیوی اور نادر علی کا ہوا ہے اور وہ انسانی عقل کی سطح سے بہت نیچے اُتر آتے ہیں۔ اُن کی شادی نصیر کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھی اور اُس کی غیر حاضری میں بھی ان کی شادی ممکن نہیں تھی کیونکہ دونوں کی ذاتوں میں بہت بڑا فرق تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس قصبے میں راجپوت برادری اپنے قواعد و ضوابط کی سختی سے پابندی کراتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جُوں ہی برادری کو پتہ چلا کہ نادر علی پہ شک کیا جا رہا ہے تو دو بُزرگ فوراً اُس کے ہاں جا دھمکے اور اُسے کہا کہ وہ نصیر کے متعلق صاف بتا دے ورنہ پولیس کو بتا دیا جائے گا۔

بیوی کو خاوند پر شک نہ تھا

میرے لئے یہ کوئی عجیب نہیں تھا کہ ان دونوں نے بھاگنے کی سکیم بنائی ہو گی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ جذبات میں آکر لوگ جو جُرم کرتے ہیں، وہ بڑی ہی دلچسپ کہانیاں بن جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔

میں نے کیس رجسٹر کر لیا۔ کاغذی کارروائی مکمل کر لی اور نصیر کے باپ سے پوچھا کہ نصیر اکثر کہاں درخت خریدنے جایا کرتا تھا۔ اُس نے تین گاؤں کے نام بتائے۔ یہ بہت دُور نہیں تھے۔ میرے ہی تھانے کے گاؤں تھے۔ کوئی تین میل دُور تھا کوئی چار میل دُور۔ وہاں درختوں کی بہتات تھی جو لوگوں کی ذاتی ملکیت تھے۔ میں نے نصیر کے باپ اور اُس کے ساتھیوں کو چند ایک ضروری ہدایات دے کر فارغ کر دیا اور پہلی کارروائی یہ کی کہ اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو یہ کام سونپا کہ وہ الگ الگ ان گاؤں میں جائیں اور معلوم کریں کہ نصیر [illegible] آیا تھا یا نہیں۔ میں نے انہیں یہ شک بتایا کہ نصیر کے پاس

رقم ہو گی جس کے لالچ میں اُسے شاید قتل کر دیا گیا ہو۔ بہرحال اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کو معلوم تھا کہ انہیں نصیر کا سراغ کس طرح لگانا ہے۔ وہاں ان کی مدد کے لئے نمبردار اور چوکیدار وغیرہ موجود تھے۔

انہیں روانہ کر کے میں نے متعلقہ افراد کے متعلق معلومات فراہم کرنے والی مشینری چلا دی۔ میں آپ کو اپنی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ یہ انسانی مشینری ہوتی ہے جسے آپ پولیس کی آنکھیں اور کان کہہ سکتے ہیں۔ آپ کے محلے میں ایک دو آدمی ایسے ہوتے ہیں جنہیں آپ ہر دلعزیز، ملنسار اور ہر کسی کے کام آنے والے سمجھتے ہیں، وہ پولیس کے مُخبر ہوتے ہیں۔ آپ کے گھر کی ہر بات سے وہ واقف ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سرکاری مخبر بھی ہوتے ہیں۔ میں نے اس مشینری کو متحرک کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک انتظام یہ کیا کہ نصیر کے گھر پر نظر رکھنے کے لئے آدمی مقرر کر دیئے۔ میں نصیر کی بیوی کی نقل و حرکت دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ رات کو نادر علی اس کے ہاں آئے گا یا یہ عورت کہیں چلی جائے گی۔

دوسرے دن تک مجھے خاصی رپورٹیں مل چکی تھیں۔ نصیر کی بیوی اور نادر علی کے متعلق انہی باتوں کی تصدیق ہوئی کہ انہوں نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ مُنہ بولے بہن بھائی ہیں لیکن ان کے تعلقات مشکوک ہیں اور بعض عورتیں کہتی ہیں کہ اس جوان لڑکی نے دو خاوند رکھے ہُوئے ہیں۔ نادر علی کے متعلق نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ نصیر کی بیوی کے ساتھ بدنام ہونے کی وجہ سے برادری میں اسے کوئی گھرانہ اپنی لڑکی دینے کو تیار نہیں۔ اس کی پہلی بیوی جب زندہ تھی تو بھی وہ نصیر کے گھر اسی طرح گھُسا رہتا تھا۔

نادر علی کی بیوی کے ماں باپ سے پتہ چلا کہ انہیں نادر علی سے کوئی شکایت نہیں تھی، نہ ہی ان کی بیٹی نے کبھی شکایت کی تھی کہ نادر علی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ لوگوں نے نادر علی کو بدنام کر رکھا ہے۔ اس کے اور نصیر کی بیوی کے تعلقات بہن بھائی

والے تھے۔

یہ رپورٹ میرے لئے عجیب تھی۔ بیوی ایسی چیز ہے کہ اور کوئی شک کرے نہ کرے، بیوی سب سے پہلے اپنے خاوند پر شک کیا کرتی ہے۔ اگر نادر علی کی بیوی نے اُس پر شک نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ نادر علی اور نصیر کی بیوی کا تعلق بہن بھائی والا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نادر علی کی بیوی بہت سادہ طبیعت کی ہو اور نادر علی اور نصیر کی بیوی بہت چالاک ہوں۔ مجھے بہرحال کسی بھی اطلاع کو محض سُن کر سچ نہیں ماننا تھا۔ میں نے اپنے مخبروں سے کہا کہ مجھے یہ معلوم کر دیں کہ نادر علی کی بیوی کس بیماری سے مری تھی اور اُس کا علاج کس نے کیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کی موت میں نادر علی کا ہی ہاتھ نہ ہو۔

بھائی اپنی بہن کو بیوہ نہیں کر سکتا

اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل دیہات سے واپس آگئے اور یہ مایوس کُن خبر لائے کہ نصیر کسی بھی گاؤں میں نہیں گیا۔ میں نے نادر علی کے گھر پہ بھی نظر رکھنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ نادر علی گھر نہیں آیا۔ یہ اُس کی غیر حاضری کا تیسرا دن تھا۔ میں نے سوچا کہ نصیر کی بیوی کے پاؤں اکھاڑے جائیں تاکہ وہ اپنے بچاؤ یا فرار کے لئے کوئی حرکت کرنے پہ مجبور ہو جائے۔

میں شام کے بعد اُس کے گھر گیا۔ میں وردی میں نہیں تھا۔ اُس کے گھر چند ایک عورتیں بیٹھی ہُوئی تھیں۔ میں نے نصیر کی بیوی سے کہا کہ وہ عورتوں سے کہے کہ اُس کے خاوند کے متعلق تھانیدار کچھ پوچھنے آیا ہے، سب چلی جائیں.... وہ چلی گئیں تو میں نے اندر سے چٹخنی چڑھا کر اُس جواں سال عورت کو بٹھا لیا۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت نہیں تھی کہ میں اسے

دیکھ کر چونک جاتا۔ اُس کا رنگ سفیدی مائل گندمی تھا۔ نقش اچھے تھے۔ البتہ اُس کے جسم کی ساخت میں کشش تھی۔ قد بہت اچھا تھا۔ میں نے اُس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی لیکن میں صرف دیکھنے سے کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔

"تمہیں بھی شک ہے کہ تمہارے خاوند کو قتل کر دیا گیا ہے؟" — میں نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

"قتل؟" — اُس کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو۔ ہکلاتی ہوئی آواز میں بولی — "اللہ نہ کرے.... آپ نے یہ کیوں پوچھا ہے؟ آپ کو کچھ پتہ چلا ہے؟"

اُس کی گھبراہٹ بناوٹی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ میں اُسے جواب دینے کی بجائے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟" — اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ کچھ اور کہنے لگی تھی کہ اُس نے ہچکی لی اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

میں نے دیکھا کہ وہ قتل پہ تڑپ اُٹھی ہے اور اُس کی حالت غیر ہو گئی ہے تو میں نے اُسے قتل پر ہی "پن ڈاؤن" کئے رکھا۔ میں اُسے یہ تاثر دیتا رہا کہ ہو سکتا ہے اُس کا خاوند قتل ہو گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں اُس کا ردِ عمل دیکھتا رہا۔ ردِ عمل تو اُس کا صاف نظر آ رہا تھا۔ میں یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس ردِ عمل میں بناوٹ کتنی ہے۔ مجھے بناوٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"انہیں کس نے قتل کیا ہو گا؟" — اُس نے تڑپتے ہُوئے پوچھا۔

"نادر علی نے!"

اب اُس کا ردِ عمل دیکھنے والا تھا۔ اُس کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ مُنہ کھل گیا اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ یہ حیرت کا اور شدید صدمے کا تاثر تھا۔ اُس پر جیسے غشی طاری ہونے لگی تھی۔

اُس نے آہستہ آہستہ دائیں بائیں سر ہلایا اور اُس کے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی — "نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" — میں نے پوچھا — "کیا نادر علی اتنا دلیر نہیں؟"

"وہ بہت دلیر ہے" — اُس نے کہا — "بھائی اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں بیوہ نہیں کر سکتا۔ وہ میرا بھائی ہے۔"

"وہ ہے کہاں؟" — میں نے پوچھا — "نادر علی کہاں ہے؟"

"تین روز سے میرے پاس نہیں آیا" — اُس نے جواب دیا — "میں کل اُس کے گھر گئی تھی۔ وہ گھر کسی کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے" — اُس نے میرے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر مجھے زور سے جھنجھوڑا اور بولی — "آپ کو اپنے اللہ کا واسطہ ہے، مجھے بتا دیں کہ میرا خاوند قتل ہو گیا ہے اور آپ نے یہ کیوں کہا ہے کہ اُسے نادر علی نے قتل کر دیا ہے۔"

"اور میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے سچی بات بتا دو" — میں نے کہا — "میں بے شک تھانیدار ہوں لیکن میرا کام صرف یہ نہیں کہ مجھے جس پر شک ہوتا ہے اُسے پکڑ کر لے جاؤں۔ میں اس کے اُلٹ بھی کام کر سکتا ہوں۔ تمہارے دل میں جو کچھ ہے مجھے بتا دو، پھر دیکھنا میں کس طرح تمہاری مدد کرتا ہوں۔"

"میرے دل میں کچھ بھی نہیں" — اُس نے جھنجھلا کر کہا — "میں جو پوچھتی ہوں، آپ وہ بتائیں۔"

"اس کے متعلق یقین نہیں کہ نصیر قتل ہو گیا ہے" — میں نے کہا — "اس کے باپ نے شک کا اظہار کیا ہے۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے۔ تم نے انہیں کیا بتایا تھا؟"

"وہ مجھے یہی کہہ کر نکل گئے تھے کہ گاؤں جا رہا ہوں، دوپہر تک آ جاؤں گا" — اُس نے کہا — "مجھے اُنہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کون سے

گاؤں جا رہے ہیں۔"

"تمہیں نادر علی کب ملا تھا؟"

"جس دن وہ (نصیر) گئے، اس سے اگلے روز آیا تھا" — اس نے جواب دیا اور مجھ سے پوچھا — "یہ کس نے کہا ہے کہ نادر علی نے انہیں قتل کیا ہے؟"

میں نے واضح کر دینا بہتر سمجھا۔ میں نے کہا — "تم نے نادر علی کو مُنہ بولا بھائی بنا رکھا ہے لیکن تم دونوں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے اور تمہارا باپ ایک نہیں۔ شک کرنے والے کسی وجہ سے شک کرتے ہیں۔"

"آپ مجھے کوئی نئی بات نہیں بتا رہے" — اُس نے کہا — "باتیں بنانے والی عورتوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھ پر تو وہ شک کرتی ہیں۔ میں اُن کی سچی باتیں اُن کے مُنہ پر بتا سکتی ہوں۔ آپ جو جی چاہے سمجھ لیں۔ میں آپ کو کیسے یقین دلا سکتی ہوں کہ میں اور نادر بہن بھائی ہیں۔"

وہ پہلی بیوی کو نہیں بھولتا تھا

اُس کے پاس اپنی پاکبازی کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ پاکباز نہیں ہے اور یہ میرا مسئلہ نہیں تھا کہ اس کا چال چلن اچھا ہے یا بُرا۔ میں کوئی سراغ لینے آیا تھا اور مجھے یہ دیکھنا تھا کہ کیا نصیر کو نادر علی نے غائب کیا ہے؟ اگر اُسی نے کیا ہے تو نصیر کی بیوی کا بھی اس میں ہاتھ ہے؟ مجھے معلوم تھا کہ نصیر کی بیوی اپنی زبان سے اقبالِ جرم نہیں کرے گی۔ اس مقصد کے لئے مجھے ایسے حالات پیدا کرنے تھے کہ وہ اپنی زبان سے بول اُٹھے، یا مجھے اتنی شہادت اور ثبوت اکٹھا کرنا تھا کہ اس کے اقبالِ جُرم کی ضرورت ہی نہ رہے۔ میں نہایت آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ وہ غمزدہ ضرور تھی،

خوفزدہ نظر نہیں آتی تھی۔

"نادر علی کی بیوی کو مرے دو سال ہو گئے ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ جوانی کی عمر میں ہے۔ اس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ .... شادی سے انکار کیوں کر دیا ہے؟"

"یہ آپ کو کس نے بتایا ہے کہ وہ شادی سے انکار کر رہا ہے؟"۔۔۔ نصیر کی بیوی نے کہا۔۔۔ "اس کی ماں سے پوچھ لیں اُس کی بہنوں سے پوچھ لیں۔"

"پھر اس نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"اُسے اپنی بیوی سے بہت محبّت تھی"۔۔۔ نصیر کی بیوی نے جواب دیا۔۔۔ "بیوی ایک سال بعد مر گئی۔ ایک سال تک تو بیوی دلہن ہی ہوتی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے نادر بھی مر گیا ہو۔ اُس کے غم کو اُس کی سگی بہنیں جانتی ہیں یا اُن سے زیادہ میں جانتی ہوں۔ وہ میرے پاس آکر جس طرح رویا کرتا تھا، وہ کسی نے نہیں دیکھا۔ مجھے وہ سگی بہنوں سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اپنے غم مجھے بتایا کرتا ہے۔ میں اُس کی دوسری شادی فوراً کرانا چاہتی تھی لیکن وہ پہلی بیوی کو نہیں بھُولتا تھا۔ اُس نے چھ سات مہینے دوسری شادی سے انکار میں گزار دیئے۔ میں اور میرا خاوند اُسے آہستہ آہستہ اس بات پر لے آئے کہ وہ شادی کر لے ....

"اُس کی برادری میں دو لڑکیاں تھیں۔ آپ شاید جانتے ہوں گے کہ یہ اُونچی ذات کی برادری ہے۔ میں نادر کے رشتے کے لئے کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ نادر نے مجھے بتایا کہ اُسے دونوں میں سے کون سی لڑکی پسند ہے۔ میں نے نادر کی بہنوں کو بتایا۔ انہوں نے اور نادر کی ماں نے رشتے کی بات چلائی۔ لڑکی والوں نے ہاں بھی نہ کہی اور نہ بھی نہ کی۔ یہی امید تھی کہ وہ رشتہ دے دیں گے۔ معلوم نہیں وہ کیوں وعدے پر ہی ٹال رہے تھے، حالانکہ نادر اتنی زیادہ جائیداد کا مالک ہے۔ آٹھ نو مہینوں بعد لڑکی والوں نے لڑکی کسی اور کو دے دی ....

"دوسری لڑکی بھی خوبصورت تھی۔ نادر نے کہہ دیا کہ وہ اسے قبول کر لے گا۔ وہاں اس کی ماں بہنوں نے بات چلائی تو وہاں بھی وعدے ہونے لگے۔ لڑکی والے خود تو ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے، اُنہوں نے دوسروں کے کانوں میں یہ ڈال دی کہ لڑکا بہت بدنام ہے۔ اُن لوگوں نے یہ بات نادر کی ماں بہنوں تک پہنچا دی۔ نادر کو معلوم ہُوا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے مجھے اور میرے خاوند سے کہا کہ وہ باہر سے راجپوت بیوی لائے گا۔ نادر میری وجہ سے بدنام ہُوا تھا۔ اُس کی ماں اور بہنوں نے مجھ پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔ وہ یہاں موجود ہیں۔ آپ اُن سے پوچھ سکتے ہیں۔ اب دو گھرانوں نے نادر کو رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو میں خود نادر کی ماں کے پاس اور اُس کی بہنوں کے پاس گئی اور انہیں کہا کہ میری وجہ سے نادر بدنام ہو گیا ہے۔ میں اسے کہوں گی کہ وہ میرے گھر نہ آیا کرے۔ آپ بھی اسے کہیں کہ میرے ساتھ تعلق توڑ لے....

"اُسی شام نادر یہاں آیا تو اُس نے غصّے میں مجھے بہت کچھ کہہ ڈالا۔ اُس نے کہا کہ تم عورت ہو اور اپنے آپ کو چھوٹی ذات کی بھی سمجھتی ہو، اس لئے تم ڈر گئی ہو۔ ڈر کر مجھ پر گھر کے دروازے بند کر دو گی تو لوگ تمہیں پھر بھی بدنام کریں گے۔ تمہاری نیّت پاک ہے۔ کسی سے نہ ڈرو۔ مجھے اگر آشنائی کرنی ہوتی تو میرے پاس دولت ہے۔ میں بڑی بڑی خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ دوستی کر سکتا ہوں .... میرا خاوند گھر پر ہی تھا۔ نادر نے اُس کے سامنے ساری باتیں کیں اور اس نے کہا کہ وہ شادی کر کے دکھائے گا....

"نادر کی برادری کے بزرگوں نے میرے خاوند کو ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا کہ تم اپنی بیوی کو قابو میں رکھو۔ نادر کو پتہ چلا تو اُس نے ان بزرگوں کے ساتھ جا ٹکر لی۔ ہم میاں بیوی بہت پریشان ہُوتے۔ ہم چھوٹی ذات کے لوگ راجپوتوں سے ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ نادر ہماری حفاظت کرتا رہا۔ میرا خاوند دیہات میں درخت خریدنے جایا کرتا ہے۔ اس طرح اُس کے

تعلقات بعض اچھے لوگوں کے ساتھ پیدا ہو گئے۔ اُس نے ایک گاؤں میں ایک راجپوت گھرانہ دیکھا جس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اُس نے اس لڑکی کو بھی دیکھا۔ بہت خوبصورت اور کنواری لڑکی ہے۔ لڑکی کے باپ کے ساتھ میرے خاوند کے تعلقات پیدا ہو گئے ....

"ایک ملاقات میں میرے خاوند نے لڑکی کے باپ سے پوچھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کہاں کر رہا ہے۔ باپ نے بتایا کہ یہ اُس کی ایک ہی بیٹی ہے اس لئے وہ اسے بڑے اچھے گھرانے میں دینا چاہتا ہے۔ میرے خاوند نے اُسے کہا کہ شہر میں ایک راجپوت جوان ہے جس کی بہت ساری زمین اور جائداد ہے .... میرے خاوند نے لڑکی کے باپ کو نادر کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ وہ نادر کے باپ کو جانتا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ نادر کو لڑکی دے دے گا۔ میرے خاوند نے میرے ساتھ بات کی۔ ہم نے نادر کو بتایا۔ نادر نے مجھے کہا کہ میں اُس گاؤں جا کر لڑکی کو دیکھوں ....

"خاوند مجھے وہاں لے گیا۔ میں نے لڑکی دیکھی۔ بہت ہی خوبصورت ہے۔ لڑکی نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی، بلکہ ایسے لگتا تھا جیسے اُسے میرا اُس کے گھر آنا اچھا نہیں لگا۔ لڑکی کی ماں نے میری اور میرے خاوند کی بہت خاطر تواضع کی اور اُس نے کہا کہ ایک جگہ لڑکی کی بات ہو رہی تھی، پہلے انہیں ٹال لیں، پھر رشتہ نادر کو دے دیں گے۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ انہوں نے لڑکی کا رشتہ دے دیا ہے۔ میرا خاوند وہاں جاتا رہتا ہے۔ اب نادر کی ماں اور بہنوں کو وہاں جانا ہے لیکن یہ میرا خاوند بتائے گا کہ کب جائیں .... اب بھی میرا خاوند اسی گاؤں کو گیا ہے۔ اُس نے مجھے رات کو بتایا تھا کہ وہ گاؤں جائے گا۔ گاؤں سے مراد یہی گاؤں تھا میرا خیال ہے ان لوگوں نے اُسے رات کے لئے روک لیا ہو گا اور اگلے دن وہ دوسرے گاؤں کی طرف درخت دیکھنے کے لئے نکل گیا ہو گا۔"

وہ رشتہ لینے گیا تھا

اُس نے جب اس گاؤں کا نام لیا تو مجھے خیال آیا کہ پہلے مجھے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ وہ اس گاؤں میں بھی گیا تھا۔ مجھے اب اس گاؤں سے بھی معلوم کرانا تھا کہ نصیر وہاں گیا تھا یا نہیں۔ یہ گاؤں میرے لئے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ اُسے اس گاؤں والوں نے غائب کر دیا ہو گا۔ مجھے کچھ ایسے بھی نظر آنے لگا کہ لڑکی کا باپ نصیر کو اپنے کسی کام کے سلسلے میں کہیں اور لے گیا ہو گا، اور نصیر خود ہی واپس آ جائے گا، مگر نادر علی کا غائب ہو جانا مجھے شکوک میں ڈال رہا تھا۔ نصیر کی بیوی سے مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اپنے طریقے سے یقین کر لیا تھا کہ یہ عورت اخلاق کی کچی نہیں۔

میں اُسے وسوسوں میں ڈال کر تھانے چلا گیا۔ اُس کے گھر پر نظر رکھنے کا میں نے جو انتظام کر رکھا تھا، اسے اور زیادہ چوکنا کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ نادر علی رات کو چوری چھپے یہاں آئے گا یا نصیر کی بیوی یہاں سے نکل جائے گی۔ یہ امکان بھی میرے ذہن میں موجود رہا کہ نصیر رہزنوں کا شکار ہو گیا ہو گا۔ ایسی صورت میں کہیں نہ کہیں سے مجھے اطلاع ملنی چاہئے تھی کہ فلاں جگہ ایک لاش پڑی ہے۔ میں اس اطلاع کا بھی انتظار کر رہا تھا۔

رات کو اسی واردات کے متعلق سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح سویرے ایک آدمی اس گاؤں کے نمبردار کو بلا لانے کو بھیجا جہاں نصیر نادر علی کے رشتے کی بات چلا رہا تھا۔ تھانے سے وہ گاؤں تقریباً چار میل دُور تھا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اِرد گرد کی زمین مٹی کے ٹیلوں اور پتھریلی ٹیکریوں والی تھی۔ غیر آباد اور ویران علاقہ زیادہ تھا۔ صرف اس گاؤں کے نمبردار کو بلانا کوئی ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ باقی تین گاؤں کے نمبرداروں کو بھی بلاؤں گا۔ اُن سے ایک تو یہ پوچھنا تھا کہ نصیر اُن کے گاؤں میں گیا تھا یا نہیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ کہنا تھا کہ وہ اپنے اپنے گاؤں

کے ارد گرد ویرانوں میں دیکھیں۔ شاید کوئی لاش گِدھوں اور درندوں کی کھائی ہوئی کہیں پڑی ہو۔ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا تھا۔ مجھ سے پہلے میرے تھانے کے دیہاتی علاقے میں ایک شہری بابو شکار کھیلنے گیا تھا۔ اُس نے کسی دیہاتی لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کی۔ دسویں روز پولیس کو ایک غار میں سے اُس کی ہڈیاں اور بندوق ملی تھی۔ مجھے یہ بھی شک ہونے لگا تھا کہ نفیر بھی کسی گاؤں میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھا ہو۔

صبح سے ہی مُخبر اور خوشامدی قسم کے دو تین شہری جو صبح سویرے تھانے میں آکر تھانیدار کو سلام کرنا عبادت سمجھتے تھے آنا شروع ہو گئے۔ نصیر بھی نہیں آیا تھا اور نادر علی بھی نہیں آیا تھا۔ نفیر کی بیوی کے متعلق کوئی نئی اطلاع نہ ملی۔ میں دوسرے کیسوں اور کاموں میں مصروف ہو گیا۔

دوپہر سے ذرا پہلے نمبردار آگیا۔ نمبرداروں کے متعلق اپنی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ بڑے کام کے لوگ ہوتے تھے۔ اپنے گاؤں بلکہ علاقے کے جرائم پیشہ لوگوں سے بھی باخبر رہتے تھے۔ بڑے کام کی مُخبری کرتے تھے مگر جسے بچانا چاہتے، اُسے بچا بھی لیا کرتے تھے اور اگر ضرورت محسوس کرتے تو جھوٹ بھی بول دیا کرتے تھے۔ میں نے اس کا انتظام کر رکھا تھا۔ پولیس کے مخبروں کو نمبردار جانتے تھے اور وہ انہیں بھی اپنے مفاد کے مطابق استعمال کر لیا کرتے تھے۔ میں نے ایک مخبر ہر نمبردار کے ساتھ ایسا لگا رکھا تھا جس کا نمبردار کو علم نہیں ہوتا تھا۔ یہ میری کوئی غیر معمولی عقلمندی نہیں تھی۔ اکثر تھانیداروں کے اپنے کچھ ذاتی مُخبر بھی ہوتے ہیں جو مخبروں کی مخبری کرتے ہیں۔ تھانیدار ان پر خصوصی عنایات کرتے ہیں.... میں نے لڑکی والے گاؤں کے نمبردار کو بلایا تو اُسے پتہ چلے بغیر وہاں کے ایک اور آدمی کو بھی اس ہدایت کے ساتھ بلا لیا کہ اُسے نمبردار نہ دیکھ سکے۔

نمبردار آگیا اور اس سے تھوڑی دیر بعد اپنا آدمی دوسری طرف سے تھانے میں آیا اور کانسٹیبلوں کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے نمبردار

سے نفیر کے متعلق پوچھا۔ نمبردار نے کہا کہ وہ اُسے نہیں جانتا۔ میں نے نصیر کے باپ کا بتایا ہوا حُلیہ نمبردار کو بتا کر پوچھا کہ فلاں دن یہ آدمی اُس کے گاؤں گیا تھا؟

اس نے لڑکی کے باپ کا نام بتا کر کہا کہ یہ آدمی اُس کے گھر گیا تھا۔ رات وہیں ٹھہرا تھا اور صبح چلا گیا تھا۔ وہ سائیکل پر گیا تھا۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ یہ آدمی اس گھر سے کسی شہری کے لئے رشتہ مانگ رہا تھا؟

"ہاں!" — نمبردار نے جواب دیا — "وہ سروری کے رشتے کے لئے وہاں جاتا ہے۔ بات تقریباً پکی ہو گئی ہے۔"

جنّات کا سراغ

اس لڑکی کا نام سروری تھا۔ میں نے نمبردار سے بہت کچھ پوچھا لیکن اُس نے یہی کچھ بتایا جو وہ بتا چکا تھا۔ میں نے اُسے اِدھر اُدھر کر دیا اور اس کے گاؤں کے اپنے آدمی کو بلایا۔ اس سے یہی پوچھا جو نمبردار سے پوچھا تھا۔ اُس نے تفصیل سے رپورٹ دی۔ یہ یاد رکھیں کہ کسی چھوٹے گاؤں میں کسی کے گھر مہمان جائے تو سارے گاؤں کو پتہ چل جاتا ہے۔

"یہ آدمی (نفیر) ہمارے گاؤں میں سروری کے گھر کبھی کبھی آتا ہے" — اُس نے بتایا — "اُس روز بھی آیا تھا۔ وہ سائیکل پر تھا۔ رات وہیں ٹھہرا۔ صبح وہاں سے گیا۔"

"رشتہ پکّا ہو چکا ہے؟"

"سروری کے باپ نے تو پکّا کر دیا ہے لیکن لڑکی مشکل سے مانے گی" — اُس نے جواب دیا — "ہو سکتا ہے لڑکی بارات آنے سے پہلے ہی غائب ہو جائے۔"

مجھے لڑکی کے رشتے کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ بات دلچسپ معلوم ہوتی تھی اس لئے میں نے تفریحِ طبع کے لئے اپنے

اس آدمی سے پوچھا کہ سروری کیوں نہیں مانے گی اور وہ کس کے ساتھ غائب ہو جائے گی۔

"گاؤں میں راجپوت ذات کا ایک خوبرو اور جوان آدمی ہے"— اُس نے بتایا —"زمیندارہ کے لحاظ سے خوشحال ہے لیکن بڑا جابر آدمی ہے۔ نامی گرامی وارداتیے اور دس نمبریئے اُس کے دوست ہیں۔ اس کے آگے کوئی سر نہیں اُٹھاتا۔ نمبردار اسی کی برادری کا ہے اور نمبردار کی اور اُس کی گہری دوستی ہے۔ اُس کا نام فیض ہے۔ سروری اور فیض کا یارانہ اتنا گہرا ہے کہ ہیر رانجھے کا کیا ہوگا۔ فیض شادی شدہ ہے لیکن اُس نے اپنی بیوی کو نہیں بسایا۔ بیوی میکے میں بیٹھی ہے۔ سروری نے کہہ رکھا ہے کہ فیض کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔ فیض سروری کے باپ سے رشتہ مانگ چکا ہے لیکن باپ رشتہ دے نہیں رہا۔ وہ بھی راجپوت ہی ہے۔ بہت شریف آدمی ہے۔ اُس کے دو بیٹے ہیں جو سروری سے چھوٹے ہیں۔ ایک کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہے اور دوسرے کی پندرہ سولہ سال۔ اپنے باپ کی طرح دونوں شریف ہیں....

"فیض نے سروری کے باپ سے کہہ رکھا ہے کہ سروری اُسی کے گھر آباد ہوگی۔ کوئی اور اسے نہیں لے جا سکے گا۔ برادری کا بھی کوئی آدمی فیض کو نہیں روک سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ سروری کو غائب کر سکتا ہے۔ سروری خود ہی غائب ہونے کو تیار ہے۔ اب یہ شہری آدمی (نصیر) سروری کے رشتے کے لئے آتا ہے۔ سُنا ہے بات پکی ہو گئی ہے۔ اب لڑکے کی ماں دن مقرر کرنے آئے گی۔ سارا گاؤں دیکھ رہا ہے کہ اس شادی کا انجام کیا ہوگا۔ اس سے پہلے گاؤں کے ایک لڑکے کے ساتھ رشتہ طے ہو گیا تھا۔ جس روز شادی کا دن مقرر ہوا، اُس شام لڑکا شام تک گاؤں میں نظر نہ آیا۔ شام کے بعد لالٹین اُٹھا کر گاؤں والے تلاش میں نکلے۔ وہ گاؤں سے تھوڑی دُور ویرانے میں بیہوش پڑا پایا گیا۔ گاؤں

میں اُٹھا کر لائے۔ ہوش میں آ گیا لیکن بتاتا نہیں تھا کہ اُسے کیا ہوا تھا۔ بار بار یہی کہتا تھا کہ سروری کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ مقرر کیا ہوا دن منسوخ کر دیا گیا۔ لڑکا کئی دن آہستہ آہستہ چلتا پھرتا رہا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ فیض نے یا سروری نے کسی ایسے عامل یا پیر فقیر سے جس کے قبضے میں جن ہیں، اس لڑکے کو جنّات سے مروایا پٹوایا اور یہ کہلوایا ہے کہ وہ سروری کے ساتھ شادی نہ کرے۔ اسی لئے لڑکا سروری کا نام سُن کر ہی ڈر جاتا ہے"۔

بے شک بات دلچسپ تھی لیکن میں اُکتا گیا تھا۔ مخبروں کی اگر آپ رپورٹیں ان کی زبانی سُنیں تو وہ تھانیداروں کو خوش کرنے کے لئے بات بڑی لمبی کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ڈھکے چُھپے حالات بھی جانتے ہیں، ذرا ذرا سی باتوں اور غیر متعلق تفصیلات بھی سنانے لگتے ہیں۔ یہ آدمی چونکہ میرا ذاتی مخبر تھا اور اسے میں نے یہ اعزاز بھی دے رکھا تھا کہ نمبردار کے خلاف بھی مخبری کرے، اس لئے وہ جب بھی آتا میرا دماغ چاٹ جایا کرتا تھا۔ اب اُس نے سروری کے رشتے کی کہانی سنانی شروع کر دی تو میں نے اکتاہٹ محسوس کی لیکن اُس نے جب اس نوجوان کا قصہ سنایا کہ شادی کا دن مقرر ہوا اور یہ نوجوان گاؤں سے کچھ دُور بے ہوش پڑا پایا گیا تو میرے دماغ کی ہر ایک رگ بیدار ہو گئی۔ سراغرسانی کی حس پھڑک اُٹھی۔ مخبر نے کہا تھا کہ سروری کے ہونے والے دُولہا کو جنّات نے مارا پیٹا ہے لیکن مجھے ان جنّات کا سراغ نظر آنے لگا۔

"کیا یہ لڑکا زخمی تھا؟"— میں نے پوچھا۔

"زخم کوئی نہیں تھا"— اُس نے جواب دیا —"اُس کا مُنہ کچھ سُوجا ہوا تھا اور چہرے پر نیلے نشان تھے۔ جسم پر ڈنڈے، لاٹھی یا پتھر کی کوئی ضرب نہیں تھی لیکن وہ کہتا تھا کہ اُس کے اندر ضربوں کا درد ہے۔ اسے اگر کسی انسان نے مارا پیٹا تھا تو گھونسے مارے تھے"۔

"کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ اُسے جنات نے مارا پیٹا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "گاؤں میں کسی کی کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ اسے فیض نے خود یا ایک دو آدمیوں سے پٹوایا تھا۔"

"یہ لڑکا گاؤں میں ہوگا؟"

"گاؤں میں ہی ہے" — اُس نے جواب دیا — "مزے کی بات یہ ہے کہ اُس کی شادی فیض نے ہی ساتھ والے گاؤں سے کرائی تھی۔"

مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میرا مجرم فیض ہے۔ کسی بھی تھانیدار کے لئے جو تفتیش اور سراغرسانی میں دیانتدار ہو، اس قسم کی اطلاع بڑی ہی کارآمد ہوتی ہے۔ نصیر بھی سروری کے رشتے کی بات نادر علی کے لئے پکی کر آیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے نصیر فیض کا شکار ہو گیا ہے۔ میں نے اس مخبر کی اس اطلاع پر یہ بھی غور کیا کہ فیض کی دوستی بدمعاشوں اور وارداتیوں کے ساتھ ہے اور نمبردار بھی اس کا گہرا دوست ہے۔

"دو روز گزرے شہر (بڑے قصبے) سے ایک جوان اور بڑی اچھی شکل وصورت والا آدمی ہمارے گاؤں میں آیا تھا" — میرے اس خاص آدمی نے بتایا — "وہ نصیر نام کے ایک آدمی کو پوچھتا پھر رہا تھا۔ نصیر وہی آدمی ہے جو سروری کے رشتے کے لئے آیا کرتا ہے۔ یہ جو دوسرا آدمی آیا تھا، اس کے متعلق پتہ چلا کہ سروری کا رشتہ اسی کے لئے لیا گیا ہے۔ فیض باہر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فیض کی اور اس کی کچھ دیر باتیں ہوتی رہی تھیں، پھر وہ آدمی سروری کے گھر چلا گیا تھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ بعد وہاں سے نکلا اور شہر کا رُخ کرنے کی بجائے دوسرے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہ پیدل تھا۔ وہ گاؤں سے تھوڑی ہی دُور گیا تو فیض اُس کے پیچھے چل پڑا۔ سروری کے دونوں بھائی اپنے مہمان کے ساتھ گاؤں کے باہر تک ساتھ آئے تھے۔ وہ فیض کو اپنے مہمان کے پیچھے جاتا دیکھ کر اپنے گھر چلے گئے اور فوراً ہی باہر آکر اُسی طرف تیز تیز چلے

گئے جدھر اُن کا مہمان اور فیض گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ وہ دوپہر کے بعد واپس آئے تھے۔"

"اور فیض؟"

"اُسے میں نے واپس آتے نہیں دیکھا" — اُس نے جواب دیا — "اُسے تو میں نے پھر دیکھا ہی نہیں۔"

جب اس کی ہڈیاں نظر آنے لگیں گی

اس آدمی کو میں نے پچھلے کمرے میں بھیج دیا اور نمبردار کو بلایا۔ اُسے میں نے سوچنے کا موقعہ دیئے بغیر کہا — "سیدھی بات کرو چوہدری! .... وہ آدمی زندہ ہے یا اُسے قتل کر دیا گیا ہے؟ .... پہلے سچ بولو پھر جو کہو گے اسی طرح کروں گا۔"

"زندہ ہے" — نمبردار نے مسکرا کر جواب دیا — "آپ کو کس نے خبر دی ہے؟"

"چوہدری تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ بات مجھ سے چھپائی کیوں ہے؟" — میں نے دوستانہ بے تکلفی سے پوچھا۔ مجھے چونکہ اس سے اپنا مطلب پورا کرنا تھا اس لئے میں نے ذرا جھک کر بات کی — "نہیں تو میں نے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ بولو یہ کیا قصہ ہے۔"

"حضور! .... وہ اپنا بچہ ہے" — اُس نے کہا — "میرا خیال تھا کہ آپ کو معلوم نہیں ہوگا۔ مجھے اب کانسٹیبلوں سے پتہ چلا ہے کہ جو آدمی سروری کے رشتے کے لئے ہمارے گاؤں جایا کرتا ہے وہ لاپتہ ہے اور آپ تفتیش کر رہے ہیں۔ پوری بات مجھ سے سنیں اور مجھ پر یہ کرم کریں کہ کیس گول کر دیں۔ آپ کا لاپتہ فرد آپ کو زندہ اور سلامت مل جائے گا۔"

مجھے اپنے لاپتہ فرد کی ہی ضرورت تھی۔ کیس گول کرنا مجھے آتا تھا۔

نمبرداروں کے ساتھ کسی کسی کیس میں ہمیں یہ سودے کرنے ہی پڑتے تھے۔ یہی نمبردار تفتیش کے سلسلے میں ہمیں بعض اوقات معجزہ نما مدد دیا کرتے تھے۔ اگر نادر علی کہیں چلا گیا تھا تو میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے پاس نصیر کی گمشدگی کی رپورٹ آئی تھی، نادر علی کی نہیں۔ میری تمام قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی تھی۔ نصیر قتل نہیں ہُوا تھا۔ لہٰذا نصیر کی بیوی اور نادر علی کم از کم اس معاملے میں بیگناہ تھے۔ ان دونوں کے آپس کے تعلقات بہنوں بھائیوں والے تھے یا نہیں، یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔

نمبردار نے فیض اور سروری کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو میرا آدمی مجھے بتا چکا تھا۔ اُس نے فیض کی تعریف یوں کی کہ اُس کا یارانہ چونکہ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہے اس لئے کہیں کوئی واردات ہو جائے فیض مجرموں کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ نمبردار اسے بچانا چاہتا تھا اور میں نے آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ اُس نے بتایا کہ فیض پہلے ایک نوجوان کو جس کے ساتھ سروری کا دن مقرر ہو گیا تھا، سبق دے چکا ہے کہ سروری کسی اور کے گھر میں آباد نہیں ہوگی۔ گاؤں میں کسی لڑکے کے والدین سروری کا رشتہ مانگنے کی جرأت نہیں کرتے۔ سروری کا باپ لڑاکا نہیں، ورنہ گاؤں میں خون خرابہ ہو چکا ہوتا۔ سروری کے باپ نے قسم کھا رکھی ہے کہ فیض کو رشتہ نہیں دے گا۔ فیض اور سروری نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ شادی کر کے رہیں گے۔ سروری اتنی دلیر ہے کہ گھر سے اُٹھ کر فیض کے گھر آباد ہو سکتی ہے لیکن فیض نے اسے امید دلا رکھی ہے کہ اس کا باپ ایک نہ ایک دن رشتہ دینے پر مجبور ہو جائے گا۔

اتنے میں نصیر شہر کے ایک آدمی کے لئے سروری کا رشتہ لینے آ گیا۔ سروری فیض کو بتاتی رہی کہ رشتے کی بات کہاں تک پہنچی ہے۔ نصیر اپنی بیوی کو لے کر بھی آیا تھا۔ جب سروری کے باپ نے وعدہ دے دیا کہ وہ نادر علی کو رشتہ دے دے گا تو سروری نے فیض کو بتایا۔ ایک بار پھر

نصیر گاؤں میں گیا تو واپسی پر فیض نے اُسے راستے میں روک کر کہا کہ آئندہ اس گھر میں رشتے کے لئے نہ آنا۔ نصیر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ دونوں کی تُو تُو مَیں مَیں ہُوئی۔ فیض نے نصیر سے کہا کہ جان سے نہیں ماروں گا لیکن جینے کے قابل بھی چھوڑ وں گا۔ نصیر نے اُسے کہا کہ میں اکیلا آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔

نمبردار نے مجھے بتایا کہ پانچ چھ دن گزرے نصیر پھر آ گیا۔ وہ سائیکل پہ سوار تھا۔ فیض نے ساتھ والے گاؤں سے دو آدمی بلا لئے۔ نصیر سروری کے گھر سے نکلا تو شہر کی طرف جانے کی بجائے ایک اور گاؤں کی سمت ہو گیا۔ فیض نے اپنے آدمیوں کو ایک خاص طرف بھیج دیا اور خود نصیر کے پیچھے گیا۔ اُس نے واپس آکر نمبردار کو بتا دیا کہ راستے میں اُس نے نصیر کو روک لیا۔ اُس کے دونوں آدمی پہنچ گئے۔ تینوں نے نصیر کو پکڑ لیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے باندھ کر اُٹھا لے گئے۔ پگڈنڈی سے ہٹ کر ٹیلوں اور چٹانوں کا ویران علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

"انہوں نے نصیر کو وہاں جا بند کیا" — نمبردار نے کہا — "وہ ابھی تک وہیں بند ہے۔ اُسے ایک وقت کھانا دیا جاتا ہے۔ اُس کا مُنہ کپڑے سے بند رکھا جاتا ہے۔ میں نے وہ جگہ نہیں دیکھی۔"

"اُسے کب تک بند رکھا جائے گا؟" — میں نے پوچھا — "اور بند کرنے کا مقصد کیا ہے؟"

"فیض اُسے سبق سکھا رہا ہے" — نمبردار نے جواب دیا — "کہتا ہے کہ جب اُس کی ہڈیاں نظر آنے لگیں گی، اُسے چھوڑ دوں گا۔"

پرانے بھٹے کی کوٹھڑی میں

نمبردار نے فیض کے جن دو جرائم پیشہ ساتھیوں کے نام بتاتے

تھے، وہ ہسٹری شیٹر تھے۔ انہیں تھانے بلانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں نے نمبر دار سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نصیر کو برآمد کر دے اور میں فیض کو نظر انداز کر دوں گا۔ اُس کی ساری بات سن کر میں نے اُسے کہا کہ وہ ابھی گاؤں جائے اور فیض سے کہے کہ نصیر کو شام سے پہلے پہلے رہا کر دے۔ جوں ہی نصیر آجائے گا، میں کیس کا غذوں میں دفن کر دوں گا۔ نمبر دار کو وہ جگہ معلوم نہیں تھی جہاں نصیر کو قید رکھا گیا تھا۔ میں نے نمبر دار سے کہا کہ وہ شام کو میرے پاس آئے اور مجھے بتائے کہ نصیر کو رہا کر دیا گیا ہے۔

نمبر دار چلا گیا مگر وہ شام کا اندھیرا گہرا ہونے تک نہ آیا۔ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ چوری چھپے پتہ کرے کہ نصیر آگیا ہے یا نہیں۔ کانسٹیبل پرائیویٹ کپڑوں میں گیا۔ اُس نے واپس آکر بتایا کہ نصیر نہیں آیا، نادر علی آگیا ہے۔

میں نے بہت سوچا کہ آیا مجھے نادر علی کی ضرورت ہے یا نہیں۔ نصیر کے آجانے سے نادر علی کی ضرورت ختم ہو جاتی تھی، مگر وہ نہیں آیا تھا۔ نمبر دار بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے نادر علی کو ضرورت کے وقت تک کے لئے نظر انداز کر دیا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو پرائیویٹ کپڑوں میں نمبر دار کو تھانے لانے کے لئے بھیجا۔ مجھے اُس پہ غصہ آ رہا تھا۔ میں سمجھنے لگا کہ اس کے ساتھ سودا کر کے میں نے غلطی کی ہے اور وہ میرے سر پر سوار ہو گیا ہے۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کے جانے کے بعد ایک تجربہ کار اور ذہین کانسٹیبل کو یہ کہہ کر گاؤں بھیجا کہ وہ اُن دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کو جو فیض کے ساتھی تھے، اس طرح تھانے میں آنے کو کہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کانسٹیبل ان دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ان کا گاؤں نمبر دار کے گاؤں سے تقریباً ڈیڑھ میل دُور تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دونوں میرا پیغام سُنتے ہی سر کے بل چل کر آئیں گے۔

پہلے نمبر دار آیا۔ اُس نے بتایا کہ فیض کو گاؤں سے گئے تین دن ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ مجھے میرے مخبر نے بتایا تھا کہ نادر علی نصیر کے پیچھے گاؤں میں گیا تھا۔ وہ جا رہا تھا تو فیض اُس کے پیچھے چل پڑا اور فیض کے پیچھے سروری کے بھائی چلے گئے تھے۔ اس کے بعد فیض واپس نہیں آیا۔ اب نمبر دار نے کہا کہ وہ واپس نہیں آیا تو مجھے غصہ آگیا۔ نمبر دار اگر سب کچھ جانتا تھا تو مجھے یہ جھوٹ نظر آتا تھا کہ اسے معلوم نہیں کہ نصیر کو فیض نے کہاں قید میں ڈال رکھا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں خواہ مخواہ نمبر دار سے دب رہا ہوں۔

"دیکھو چوہدری!" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "حوالات میں بند کر دوں گا۔ میرا تمہارا سودا ختم ہے۔ میں مان نہیں سکتا کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ نصیر کو فیض نے کہاں رکھا ہُوا ہے۔"

نمبر دار نے قسمیں کھائیں۔ میرے آگے ہاتھ جوڑے اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُسے معلوم نہیں۔ میں نے اسے کانسٹیبلوں کے کمرے میں بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جرائم پیشہ آگیا۔ دوسرے کے متعلق پتہ چلا کہ آ رہا ہے۔ جو آگیا تھا، اسے میں نے اپنے دفتر میں بٹھا کر پوچھا کہ اس آدمی کو کہاں بند کر رکھا ہے۔ اُس نے نیں و پیش کی تو میں نے کہا ــــ "گاؤں کا نمبر دار بھی یہاں موجود ہے اور تمہارا دوسرا ساتھی بھی۔ اگر مجھے کچھ بتانے سے انکار کرنا چاہتے ہو تو کر دو۔ میرا ہاتھ تم پر نہیں اُٹھے گا۔ صرف اتنا کروں گا کہ تمہیں حوالات میں بند کر دوں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پاس نہ کیسوں کی کمی ہے نہ گواہوں کی۔ تمہاری اس واردات کے متعلق مجھے بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ مجھے تمہارے اقبال کی ضرورت نہیں۔ اگر میری مدد کرو گے تو ہماری دوستی پکّی رہے گی۔"

یہ لوگ تو ہماری ہتھیلی میں ہوتے تھے۔ اُس نے فیض کے متعلق وہی کچھ بتایا جو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے نمبر دار کے بیان کی بھی تصدیق کر دی اور یہ بھی بتایا کہ نمبر دار کو واقعی معلوم نہیں کہ نصیر کو کہاں

بند کیا گیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ پگڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ٹیلوں اور چٹانوں کا ویران علاقہ دُور تک چلا گیا ہے۔ وہاں کوئی آبادی نہیں۔ کبھی کسی زمانے میں وہاں اینٹوں کا بھٹہ ہُوا کرتا تھا جو کبھی کا اُجڑ چکا ہے۔ وہاں پتھروں اور مٹی کا ایک کمرہ ہے جو بھٹے والوں نے اپنے لئے بنایا تھا۔ یہ ابھی تک صحیح سلامت ہے۔ نصیر کو اس میں بند رکھا گیا ہے۔

"فیض نے ہمیں خاصی اُجرت دی ہے" ___ اُس نے کہا ___ "اس آدمی کو دو دنوں بعد چھوڑ دینا تھا لیکن آدمی بڑا اکھڑ ہے۔ اس کوٹھڑی میں لے جا کر ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے اور فیض نے اسے کہا کہ سروری کے رشتے سے باز آ جاؤ اور آئندہ اس گاؤں میں نہ آنا.... نصیر نے فیض سے کہا کہ میں تمہیں پہلے بھی ایک بار کہہ چکا ہُوں کہ میں نے سروری کا رشتہ اپنے دوست کے لئے لیا ہے اور میں تمہارے ڈر سے رشتے سے بھاگ نہیں جاؤں گا۔ تم تین ہو اور میں اکیلا ہوں۔ ایک ایک میرے سامنے آؤ.... اُس نے فیض کو بڑی ننگی بات کہہ دی۔ فیض نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ نصیر نے فیض کے مُنہ پر گھونسہ مارا۔ ایک لات میرے پیٹ میں ماری۔ میں دُہرا ہو گیا۔ ہم تین تھے اس لئے اُسے گرا لیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے۔ فیض نے کہا کہ اس کی مار پٹائی بالکل نہ کرو۔ یہیں بند رہنے دو۔ دن میں صرف ایک بار کھانے کے لئے دو اور جب یہ لاش کی طرح ہو جائے تو اسے رات کو اُٹھا کر شہر لے جانا اور اس کے گھر کے آگے پھینک آنا....

"فیض چلا گیا۔ میں اور میرا ساتھی رات کو اس پر باری باری پہرہ دیتے ہیں۔ دروازے کے باہر ہم تالا لگا کر رکھتے ہیں۔ اس کے مُنہ پر کپڑا باندھ دیتے ہیں تاکہ اس کی آواز باہر نہ نکلے۔ فیض دو دفعہ وہاں گیا تھا اور اسے کہا تھا کہ سروری کے رشتے سے ہاتھ اٹھا لو۔ اس کے جواب میں نصیر خاموش رہتا یا یہ کہتا ہے کہ اگر یہاں سے زندہ نکل گیا تو سروری کو اپنے دوست کے گھر بساؤں گا۔ اب یہ شخص کمزور ہو گیا ہے لیکن ہار

نہیں مانتا۔"

اس کا رنگ لاش کی مانند تھا

فیض یہ جُرم جذبات کے زیرِ اثر کر رہا تھا اور وہ اپنی زمینداری اور بدمعاشوں کی دوستی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس علاقے کا ٹارزن سمجھتا تھا۔ وہ احمقانہ طریقے سے ایک گھناؤنا جرم کر رہا تھا۔ میں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ نمبردار کو بھٹے کی اس کوٹھڑی کا علم نہیں تھا۔ اُس نے میری مدد کی ورنہ تفتیش میں مجھے بہت پریشانی ہوتی۔ میں نے اس کے عوض کیس گول کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن جرم کی نوعیت ایسی تھی کہ میں اس کے مجرموں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کر تو سکتا تھا مگر میں نے نظر انداز کرنا بہت بُری بددیانتی سمجھا۔ فیض جیسے بدکردار آدمی کو میں نے بخش دینا گناہِ کبیرہ سمجھا۔

فیض کا دوسرا ساتھی بھی آ گیا تھا۔ میں نے پہلے کو حوالات میں بند کرا دیا اور دوسرے سے پوچھا ___ "تم لوگوں نے جسے پرانے بھٹے کی کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے اُس کی سائیکل بیچ ڈالی ہے یا ابھی اپنے گھر میں رکھی ہوئی ہے؟"

وہ مسکرایا اور ہاتھ جوڑ کر بولا ___ "ہم اُسے چھوڑ دیں گے حضور! آپ اُس سے پوچھ لینا۔ ہم نے اُسے مارا پیٹا نہیں۔ فیض نے کہا تھا کہ اسے صرف ڈرانا ہے.... سائیکل میرے گھر میں ہے۔"

اس سے مجھے یہی توقع تھی۔ میرے پہلے سوال سے ہی وہ جان گیا تھا کہ واردات کی تفتیش کامیابی سے مکمل ہو چکی ہے، اس لئے اُس نے یہی بہتر سمجھا کہ مان جائے۔ اُس نے بھی وہی کہانی سنائی جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ اُس سے میں نے فیض کے متعلق پوچھا کہ وہ گاؤں میں ہے یا کہاں ہے۔ اُس نے بتایا کہ فیض دو تین دن سے نظر نہیں آ رہا۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔

میں نے دونوں ملزموں کو ہتھکڑیوں میں اپنے ساتھ لیا۔ نمبردار بھی ساتھ تھا۔ اپنا سٹاف بھی ساتھ لے لیا اور میں فیض کے گاؤں کو روانہ ہُوا۔ تھانے کے احاطے سے نکلا ہی تھا کہ اپنا ایک آدمی باہر سے آیا اور مجھے ایک طرف کر کے اُس نے مجھے بتایا کہ نادر علی آگیا ہے۔ اگر نصیر کا سراغ نہ مل چکا ہوتا اور اُس کی گمشدگی کی پوری کہانی میں نہ سن چکا ہوتا تو نادر علی کی واپسی میرے لئے بہت بڑی خبر ہوتی اور میں اطلاع ملتے ہی اُس کے گھر جا دھمکتا، مگر اب مجھے نادر علی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس واردات میں ملوّث نہیں تھا۔ لہٰذا میں فیض کے گاؤں کو چلا گیا۔

اس گاؤں میں جا کر فیض کے دروازے پہ دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ میں نے فیض کے متعلق پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ تین دنوں سے کہیں گیا ہُوا ہے۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے میں نے اس کے گھر کی تلاشی لی۔ وہ نہ ملا۔ میں نے گاؤں کے تین معزز آدمی ساتھ لئے اور ان کے سامنے فیض کے ساتھیوں سے کہا کہ ہمیں وہاں لے چلو جہاں تم نے شہر کے ایک آدمی نصیر کو بند کر رکھا ہے۔

وہ چونکہ جرائم پیشہ تھے، پولیس کا طریقۂ کار جانتے تھے، اس لئے وہ پہلے ہمیں اُس جگہ لے گئے جہاں اُنہوں نے نصیر کو روکا اور اُسے باندھ کر پُرانے بھٹے کی طرف لے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے راستہ دکھایا جو باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ وہ ویرانہ تھا۔ اُس زمانے میں آبادیاں بہت کم اور ایسے ویرانے زیادہ تھے جہاں عام گزرگاہیں نہیں تھیں۔ وہ ہمیں پرانے بھٹے تک لے گئے۔ بھٹہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ بیس پچیس سال سے ویران پڑا ہے۔ وہاں مجھے ایک کوٹھڑی دکھائی گئی۔ باہر تالا لگا ہُوا تھا۔ ملزموں میں سے ایک نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا۔

میں کوٹھڑی میں داخل ہُوا تو بدبُو نے جیسے دھکا دے کر مجھے باہر پھینک دیا ہو۔ کوٹھڑی کی نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان۔ نصیر کتنی دنوں سے اندر بند تھا۔ وہ پیشاب وغیرہ اندر ہی کرتا تھا۔ میں نے ناک کے

آگے رومال رکھا اور دونوں ملزموں کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے ہُوئے ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے مُنہ پر کپڑا بندھا ہُوا تھا۔ ٹانگیں آگے کو لمبی کر رکھی تھیں۔ ٹخنے رسیوں میں جکڑے ہُوئے تھے۔ ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہُوئے تھے۔

میرے کہنے پر ملزموں نے اُس کے مُنہ سے کپڑا کھولا، پھر اُس کے ہاتھ اور پاؤں کھول دیئے۔ وہ اُٹھا۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے پہلے نہیں دیکھا تھا، پھر بھی میں کہہ سکتا تھا کہ یہ جوان آدمی چند دنوں میں بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں اور اُس کا رنگ لاش کی مانند تھا۔ اُس نے گاؤں کے تین معززین کو میرے کہنے پر اپنا نام، ولدیّت اور پتہ بتایا۔

میں نے اُس کی برآمدگی کی کاغذی کارروائی مکمل کر لی اور اس پر اُن آدمیوں کے انگوٹھے لگوائے جنہیں میں ساتھ لایا تھا۔

فرعون کو گدھ کھا رہے تھے

وہاں سے جب ہم گاؤں کو واپس جانے لگے تو گاؤں کے معززین نے کہا کہ جس راستے سے ہم آئے تھے، وہ لمبا تھا، ایک چھوٹا راستہ ہے۔ دراصل راستہ تو یہ بھی نہیں تھا۔ یہ لوگ مجھے ٹیلوں اور ٹیکریوں کے درمیان سے لے جا رہے تھے۔ ذرا آگے جا کر ہم بلندی پر چل رہے تھے۔ میں نے گدھ اُترتے دیکھے جو کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا ——"لاش ہے۔ گدھ کھا رہے ہیں۔"

سب نے دیکھا۔ نیچے جگہ ہموار اور کُھلی تھی۔ گدھ کسی انسان کی لاش کھا رہے تھے۔ ہم نیچے اُترے۔ گدھوں کو پتھر مارے۔ گدھ اُڑ گئے۔ سب سے پہلے نمبردار کی آواز سُنائی دی ——"یہ تو فیض معلوم ہوتا ہے!"

گاؤں کے معززین، دونوں ملزموں اور نصیر نے دیکھا۔ سب نے کہا کہ یہ فیض کی لاش ہے۔ لاش کی حالت یہ تھی کہ چہرہ ابھی بالکل سلامت

تھا۔ سر اور کندھے بھی ٹھیک تھے۔ پیٹ اور سینہ پھٹا ہوا تھا اور اندر سے دونوں خالی تھے۔ دو ٹانگیں اور ایک بازو درندوں نے یا گِدھوں نے کھا لئے تھے۔

یہ میرے لئے دوسرا کیس تھا۔

میں وہیں رُک گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ نصیر کو میرے گھوڑے پر ہسپتال لے جائے۔ اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کا علاج بھی کرانا تھا اور اُس کی اس کیفیت کی ڈاکٹری رپورٹ بھی لینی تھی۔ میں نے سب کو لاش سے دُور ہٹا دیا اور لاش کے اِرد گرد زمین کو دیکھنے لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل نصیر کو گھوڑے پر بٹھا کر چلنے لگا تو میں نے اُسے کہا کہ کھوجی کو گھوڑے یا ٹٹو پر جتنی جلدی ہو سکے بھیج دے۔

یہ جگہ چونکہ عام گزرگاہ نہیں تھی اس لئے زمین پر کچھ نشان نظر آ رہے تھے۔ وہاں پانچ چھ قدم کے فاصلے پر ایک ٹیلہ تھا جس میں قدرتی گُف سی بنی ہوئی تھی۔ زمین کے نشان بتاتے تھے کہ لاش اس کے اندر رکھی گئی تھی۔ بھیڑیوں نے اسے باہر گھسیٹا ہوگا۔ گُف فراخ نہیں تھی اس لئے بھیڑیئے اور گیدڑ گُف میں اسے نہیں کھا سکے تھے۔ دو بھیڑیئے مل کر لاش کو گھسیٹ سکتے تھے۔ وہ لاش کو پانچ چھ قدم تک لے گئے تھے۔ خون کہیں بھی نہیں تھا۔ گُف کے اندر بھی خون نہیں تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کہیں اور قتل کیا گیا اور لاش گُف میں چھپائی گئی۔

لاش کی حالت درندوں اور گِدھوں نے ایسی کر دی تھی کہ یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ اسے کس طرح ہلاک کیا گیا ہے۔ گردن ابھی سلامت تھی۔ گردن پر گلا گھونٹنے کے یا رسی کے نشان نہیں تھے۔ میں نے گاؤں سے چارپائی منگوائی۔ چارپائی کے ساتھ سارا گاؤں آ گیا۔ قتل کوئی بھی ہو جائے، ہر کسی کے لئے افسوسناک اور سنسنی خیز ہوتا ہے۔ یہ تو گاؤں کا خاص آدمی تھا۔ اس سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔ سروری جیسی خوبصورت لڑکی اس پر مرتی تھی اور اُس نے اعلان کر رکھا تھا کہ وہ اسی کے ساتھ شادی کرے گی۔

گاؤں والوں کے لئے فیض کا قتل بہت بڑا واقعہ تھا جو حیران کُن بھی تھا — فیض کو قتل کرنے کی بھلا کون جرأت کر سکتا ہے؟

اب یہ معلوم کرنا میرا کام تھا کہ جس ٹارزن سے جنگل کے درندے بھی ڈرتے تھے، اُسے قتل کرنے کی جرأت کس انسان نے کی ہے۔

میں نے فیض کی کھائی ہوئی لاش کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ دیکھتے دیکھتے میرے ذہن سے نکل گیا کہ میں تھانیدار ہوں اور مجھے تفتیش کرنی ہے۔ اس خیال نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے کہ انسان زندہ ہوتا ہے تو اُسے نہ خدا یاد رہتا ہے نہ خدا کا قانون۔ اُسے دولت مل جاتی ہے تو خود کو اپنے سے کمزور انسانوں کا بادشاہ سمجھ لیتا ہے۔ میرے سامنے جس کی لاش پڑی تھی وہ گاؤں کی سب سے زیادہ حسین لڑکی کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ لڑکی کے باپ اور بھائیوں کے لئے وہ دہشت بنا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں فرعونیت اتنی تھی کہ اس کے ڈر سے اس لڑکی کا رشتہ لینے کی کوئی جرأت نہیں کرتا تھا۔ دو نے جرأت کی تھی۔ ایک کو اس نے مار پیٹ کر ایسا خوفزدہ کیا کہ اُس نے شادی کا دن مقرر ہونے کے باوجود شادی سے انکار کر دیا، اور دوسرے کو اُس نے اپنے قانون کے تحت قید میں ڈال دیا۔ یہ شخص شرابی تھا۔ شراب اور امیری نے اسے فرعون بنا دیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاں اس نے ایک امیر آدمی کو قید میں رکھ کر یہ حکم دیا ہے کہ جب یہ لاش کی طرح ہو جائے تو اسے چھوڑ دینا، وہاں اس کی اپنی لاش پڑی ہوگی اور اسے گِدھ اور گیدڑ کھائیں گے۔

اُس نے موت کو بھی شاید اپنا غلام سمجھ لیا تھا، مگر خدا نے اسے ایسی موت دی کہ دوسروں کے لئے عبرت کا سامان بن گیا۔ اگر میں تھانیدار نہ ہوتا تو اس کی لاش گاؤں کے وسط میں جا رکھواتا اور لوگوں کو بلا کر دکھاتا اور کہتا کہ یہ دیکھو انسان کا انجام اور گناہوں کی سزا، مگر انسان عبرت حاصل نہیں کرتے۔ دوسروں کے انجام دیکھ کر بھی اپنے آپ کو یہ دھوکہ

دیتے رہتے ہیں کہ اُن کا انجام ایسا نہیں ہوگا۔

لاش کے اِرد گرد فیض کے خاندان کی عورتوں کے بَین اور سینہ کوبی شروع ہو چکی تھی۔ میں کسی کو قریب نہیں آنے دے رہا تھا۔ مرد دھاڑیں مار رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سروری کا باپ اور بھائی خوش ہوں گے۔ سروری کی حالت کا مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ اپنے گھر بیٹھی رو رہی ہو گی۔

شادی سے پہلے پاک رہنا چاہتی تھی

میں نے لاش چارپائی پر رکھوا دی۔ ناف سے اُوپر کا دھڑ اکٹھا رہا۔ دونوں ٹانگیں الگ اور ایک بازو الگ ہو گیا۔ ٹانگوں کی ہڈیاں سمیٹ کر چارپائی پر رکھی گئیں۔ اس حالت میں لاش قصبے کے سِول سرجن کے پاس پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی اور میں خود وہیں تفتیش میں مصروف ہو گیا۔ قصبے میں عام قسم کے پوسٹ مارٹم کا انتظام تھا۔ میں نے سب سے پہلے کاغذی کارروائی مکمل کی اور پھر پوچھ گچھ شروع کر دی۔ یہ تو بڑا لمبا سلسلہ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کی تفصیل آپ کو سناؤں۔ میں آپ کو انتہائی ضروری حصے سناؤں گا۔

میرا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ ایک خیال یہ تھا کہ اس کا یارانہ عادی مجرموں کے ساتھ تھا۔ ان میں سے کسی نے اِسے ختم کر دیا ہوگا۔ دوسرا شک یہ کہ کوئی آدمی اس کے ہاتھوں اتنا تنگ آ چکا ہوگا اُس نے موقع دیکھ کر انتقام لے لیا۔ تیسرا شک یہ تھا کہ اس نے کسی کی بیٹی یا بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہوگا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ نصیر نے انتقامی کارروائی کی ہو۔ وہ تو خود اس کی قید میں تھا۔

نصیر کا خیال آتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ میرے ذاتی مُخبر نے مجھے بتایا تھا کہ نادر علی فیض کے گاؤں میں نصیر کا پتہ کرنے آیا تھا۔ وہ رات سروری کے گھر ٹھہرا تھا۔ صبح گیا۔ مُخبر نے دیکھا کہ نادر علی گاؤں سے نکل گیا تو فیض اُس

کے پیچھے گیا تھا۔ اُسے جاتا دیکھ کر سروری کے دونوں بھائی ہاتھوں میں ڈنڈے لئے اُس کے پیچھے چلے گئے تھے۔ وہ تو واپس آ گئے تھے، فیض واپس نہیں آیا۔ نمبردار نے بھی اور فیض کے جرائم پیشہ ساتھیوں نے بھی مجھے بتایا کہ فیض کسی کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے۔

تو کیا سروری کے دونوں بھائی اور نادر علی فیض کے قاتل ہیں؟ میں جوں جوں غور کرتا تھا، مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہی تین قاتل ہیں۔ سروری کے بھائیوں کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ شریف لڑکے ہیں۔ فیض سے وہ ٹکر نہیں لے سکتے، لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ کچھ اور تھا۔ میں نے بزدلوں کو دن دہاڑے قتل کرتے دیکھا ہے۔ اُن کے ساتھ نادر علی ہوگا۔ اُس نے اُن کا حوصلہ بڑھایا ہوگا۔

کھوجی آ گیا لیکن سورج غروب ہو گیا۔ میں نے اس علاقے میں پہرے کا انتظام کر دیا تاکہ کوئی آدمی رات کو اِدھر آ کر کھُرے مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے گاؤں میں نمبردار کی بیٹھک میں ڈیرہ ڈال دیا۔ سروری کے بھائیوں پہ مجھے شک تھا لیکن میں نے ابھی انہیں تفتیش میں شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فیض کے ساتھی ہتھکڑیوں میں بندھے ہُوئے میرے ساتھ تھے۔ انہیں میں نے حوالات میں رکھنے کی بجائے گاؤں میں ہی رکھا۔ انہیں کھانا کھلایا اور اِن سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ وہ حیران تھے کہ فیض کو کون قتل کر سکتا ہے۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ فیض کی دشمنی کسی نامی گرامی ڈاکو یا جواری سے ہو گی، مگر مجھے کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔

رات کو میں نے کاغذات تیار کئے اور جہاں جہاں بھیجنے تھے بھیج دیئے۔ رات کو میں نے یہ کارروائی بھی کی کہ اپنے اے۔ ایس۔ آئی کو پیغام بھیجا کہ پیغام ملتے ہی نادر علی کے گھر چلا جائے اور وہ جس حالت میں ہو، اُسے تھانے لے جائے مگر حوالات میں بند نہ کرے، اُس پر ایک کانسٹیبل کھڑا کر دے۔ پیغام لے جانے والے اسی آدمی سے میں نے کہا کہ اے۔ ایس۔ آئی

ہسپتال سے پوسٹمارٹم رپورٹ لے کر مجھے بھیج دے۔

نمبردار کو میں نے بہت ذلیل کیا کہ ایک آدمی گاؤں میں اس حد تک من مانی کرتا رہا کہ ایک باپ اپنی بیٹی کا رشتہ اپنی مرضی سے نہیں دے سکتا اور نمبردار بجائے اس کا ہاتھ روکنے کے یا تھانے میں اطلاع دینے کے اس کا دوست بنا رہا اور اس نے میرے ہاتھوں اسے بچانے کی کوشش کی۔ نمبردار میرے آگے ہاتھ جوڑتا اور معافی مانگتا رہا۔ اس نے میرے آگے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیا مگر فنیش کے قاتل کا کوئی اشارہ نہ ملا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ فنیش نوجوان لڑکیوں کا شکاری تھا لیکن سروری واحد لڑکی تھی جس کے ساتھ اس کی محبت پاک تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سروری شادی سے پہلے پاک رہنا چاہتی تھی۔

انہوں نے لاش اٹھا رکھی تھی

رات بھر کی جھک جھک سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ آدھی رات کے بہت بعد مجھے تھانے سے پوسٹمارٹم رپورٹ مل گئی اور یہ اطلاع بھی کہ نادر علی کو تھانے میں بٹھا لیا گیا ہے۔ پوسٹمارٹم رپورٹ حتمی نہیں تھی چونکہ لاش میں پھیپھڑے، تلی، دل، جگر، معدہ، انتڑیاں اور گردے وغیرہ نہیں تھے، اس لئے ڈاکٹر موت کا سبب معلوم نہ کرسکا۔ وہ لاش کو ماہرین کے معائنے کے لئے دلی بھیج رہا تھا۔ البتہ ڈاکٹر نے مجھے بڑے کام کا ایک سراغ دے دیا۔ لاش کے کندھے، گردن، چہرہ اور پیٹھ کا بالائی حصہ (شولڈر بلیڈ) سلامت تھا۔ ڈاکٹر نے لکھا کہ پیٹھ پر لمبے اور نیلے نشان ہیں۔ ایسے ہی نشان گردن کے ساتھ کندھے پر بھی ہیں اور سر میں تین جگہوں پر بھی ضربوں کے نشان ہیں۔ یہ بڑی واضح شہادت ہے کہ مقتول کو لاٹھیوں سے مارا گیا ہے — چونکہ جسم کا بیشتر حصہ، خصوصاً پیٹ غائب تھا، اس لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ مقتول کو تیز دھار آلے سے مارا گیا ہے یا نہیں۔ یہ معلوم

کرنا بھی مشکل تھا کہ مقتول کو مرے کتنے دن گزر گئے ہیں۔ تاہم سول سرجن نے تین دن لکھے تھے۔

لاٹھیوں کی ضربوں سے مجھے یاد آگیا کہ میرے مخبر نے مجھے تھانے میں بتایا تھا کہ سروری کے بھائی جب نادر علی اور فنیش کے پیچھے گئے تھے تو دونوں بھائیوں کے ہاتھوں میں جو ڈنڈے تھے، وہ کتنے موٹے اور کس قسم کے تھے اور کیا نادر علی کے پاس بھی کچھ تھا؟ — مخبر نے بتایا کہ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ نادر علی کے ہاتھ میں بید کا موٹا ڈنڈہ تھا جس کی لمبائی گز کے لگ بھگ تھی۔ یہ اس زمانے میں لوگ ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔

صبح طلوع ہوتے ہی میں کھوجی کو لاش کی برآمدگی کی جگہ لے گیا۔ میں نے خود بھی کھرے دیکھنے کی کوشش کی۔ بہت دیر بعد کھوجی کو کھرا مل گیا۔ وہ اس پر چلتا گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ تین آدمیوں کے کھرے ہیں۔ ان دنوں نہ مینہ برسا تھا نہ آندھی آتی تھی اس لئے کھرے موجود تھے، بجھے نہیں تھے۔

دوسرا فائدہ یہ کہ اس طرف سے اور کوئی گزرا ابھی نہیں تھا۔ کھرے ٹیلوں کے درمیان سے ہوتے اوپر چلے گئے۔ اوپر زمین اور زیادہ کچی تھی۔ تینوں کھرے صاف نظر آتے رہے۔ دو تین جگہوں پر کھوجی نے بتایا کہ یہاں یہ تینوں رکے ہیں اور ایک جگہ ادھر ادھر ہو کر آگے چل پڑے ہیں۔

"کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے لاش اٹھا رکھی ہے؟" — میں نے پوچھا — "میرا مطلب ہے کہ انہوں نے کوئی ایسا بوجھ اٹھا رکھا ہے کہ انہیں رک کر بوجھ کے نیچے جگہ بدلنے کی ضرورت پڑتی رہی ہے؟"

"ان کی چال ایسی نہیں لگتی کہ تینوں بڑے آرام سے یا قدرتی طریقے سے چلتے گئے ہوں" — کھوجی نے کہا — "ان کے پاؤں ٹھیک طرح نہیں پڑے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بوجھ اٹھا رکھا ہے۔"

جہاں ہم رک کر ایسی ایک جگہ دیکھ رہے تھے جہاں تینوں رکے

اور اِدھر اُدھر ہوتے تھے، وہاں ایک ڈنڈہ پڑا تھا۔ یہ ڈیڑھ اِنچ موٹا اور ایک گز سے کچھ کم تھا۔ یہ خراد پہ گول کیا گیا تھا۔ میں نے ڈنڈہ اٹھا لیا۔ ہم اور آگے گئے تو ایک جگہ کھوجی رُک گیا۔ اُس نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا۔ وہاں کھوجی کی آنکھ کی ضرورت نہیں تھی۔ زمین نرم تھی۔ کھُرے گڈمڈ تھے اور دُور دُور تک پھیلے ہُوئے تھے۔ یہاں لڑائی ہوئی تھی۔ کھوجی نے غور سے کھُرے دیکھے۔ اُسے دو کھُرے الگ مل گئے۔ یہ اُن تینوں میں سے تھے جو یہاں سے لاش کی جگہ تک گئے تھے۔

وہاں سے پگڈنڈی تقریباً ایک فرلانگ دُور تھی۔ راستے میں کھیت آگئے تھے اس لئے کھُرا اُٹھانا مشکل ہوگیا۔ کھوجی اپنے فن میں حیران کُن حد تک مہارت رکھتے تھے۔ وہ کھوجی آگے بھی کھُرا چلا سکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں نے قاتلوں کا سراغ پا لیا ہو۔ مَیں نے کھوجی کو ساتھ لیا اور گاؤں میں چلا گیا۔

نمبردار کی بیٹھک میں جاکر سروری کے دونوں بھائیوں کو بُلایا۔

بھائی بھی خوبصورت تھے

پہلے بڑے بھائی کو اندر بُلایا۔ اُس کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ خوبصورت نوجوان تھا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ خوف اور گھبراہٹ نے اسے نارمل نہیں رہنے دیا۔ میں تھکا ہُوا تھا اس لئے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر شفقت کے لہجے میں کہا ——”ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارے ماتھے پہ لکھا ہے کہ تم غیرت مند بھائی ہو۔ مجھے تھانیدار نہ سمجھو، اپنا بھائی سمجھو۔ یہاں ہم دونوں بیٹھے ہیں۔ کوئی تیسرا آدمی نہیں۔ میں لکھوں گا کچھ بھی نہیں۔ دل کھول کر بتا دو۔ مجھے بہت

خوشی ہے کہ اس آدمی کے قتل ہو جانے سے تمہارا گاؤں پاک ہوگیا ہے“۔

وہ بدستور گھبراہٹ میں تھا۔ میں نے اور زیادہ بے تکلفی سے بات کی لیکن اُس کی زبان نہ کھُلی۔ ڈنڈہ جو مجھے کھُرے دیکھتے ملا تھا، وہ پلنگ پہ پڑا تھا۔ میں نے ڈنڈہ اُٹھا کر اُس کے آگے کیا۔

”یہ تمہارا ہے یا تمہارے چھوٹے بھائی کا؟“ —— میں نے پوچھا۔

وہ بدک گیا اور مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

”یہ ڈنڈہ تمہارے پاس تھا یا تمہارے بھائی کے پاس؟“

اُس نے جواب نہ دیا۔ وہ بے شک شریف لڑکا تھا اور دیہاتی بھی تھا لیکن راجپوت ذات کا اور خوشحال زمیندار کا بیٹا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے سے گھبراہٹ کم ہو رہی تھی۔

”تم نادر علی کے ساتھ کہاں تک گئے تھے؟“

”تھوڑی دُور تک“ —— اُس نے جواب دیا۔

”تم تو گاؤں کے باہر ہی رُک گئے تھے“ —— میں نے کہا —— ”پھر تم دونوں بھائی گھر آکر اور ڈنڈے اُٹھا کر نادر علی کے پیچھے کیوں دوڑے گئے تھے؟ .... مجھے صرف اس سوال کا جواب دے کر میری تسلّی کر دو اور چھٹی کرو“۔

”پولیس کی تسلّی تو خُدا بھی نہیں کر سکتا“ —— اُس نے کہا —— ”آپ مجھ سے سیدھا یہ پوچھیں کہ فیض کو تم نے قتل کیا ہے؟“

”پھر تم کیا جواب دو گے؟“

”کہ میں نے اُسے قتل نہیں کیا“ —— اُس نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔

”اگر میں کہوں کہ قاتل تم ہو، تمہارا چھوٹا بھائی ہے اور نادر علی ہے تو کیا کرو گے؟“

”یا علی کا نعرہ لگا کر پھانسی چڑھ جاؤں گا“ —— اُس نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے پیار اور محبّت کے سارے داؤ آزما لئے۔

اس نوجوان کے مُنہ سے ہاں نہیں نکلی۔ اُس کا خوف ختم ہو چکا تھا۔ بیگناہ
کے انکار اور گناہگار کے انکار میں فرق ہوتا ہے اور اس فرق کو کوئی
ماہرِ نفسیات سمجھ سکتا ہے یا تھانیدار۔ اُس کا انکار بتا رہا تھا کہ وہ مجرم
ہے، حالانکہ وہ بڑی جاندار آواز میں انکار کر رہا تھا۔ میں نے اُسے یہ
بھی کہا کہ اُس نے کسی معصوم اور بے گناہ کو قتل نہیں کیا اور مجھے خوشی
ہے کہ اُس نے شریفوں کی عزّت کے ساتھ کھیلنے والے کو قتل کیا ہے
اور سارے گاؤں کے ساتھ نیکی کی ہے اور میں اُسے پھانسی نہیں چڑھنے
دوں گا، مگر اُس نے اپنا انکار برقرار رکھا۔ مجھے غصّے کی بجائے ہنسی
آگئی۔

اُسے باہر بیٹھنے کو کہا اور اُس کے چھوٹے بھائی کو اندر بلایا۔ اس
کی عمر سولہ سال بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ یہ لڑکا اپنے بڑے بھائی سے
زیادہ خوبصورت تھا اور اُس کے چہرے پر مردانہ وقار تھا۔ فیض کے کردار
اور اُس کی مجرمانہ حرکتوں کی میں کہانیاں سن چکا تھا۔ میں یہ بھی سُن چکا
تھا کہ ان بھائیوں کی بہن کی شادی کا دن مقرر ہو چکا تھا مگر فیض نے
ہونے والے دولہا کو ایسے ظالمانہ طریقے سے مارا پیٹا اور ایسا ڈرایا کہ اُس
نے شادی سے انکار کر دیا۔ میں خود اسی معاشرے کا اور ایسے ہی دیہات
کا رہنے والا تھا۔ میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ لڑکی کے والدین اور ان
دونوں بھائیوں پر کیا گُزری ہو گی۔ یہ سب گاؤں میں منہ چھپاتے پھرتے
ہوں گے۔ ان کی خوشیوں پر پانی پڑا اور بے عزّتی الگ ہوئی۔

میں نے اس کمسن لڑکے کو دیکھا تو مجھے اس پر ترس آگیا۔ اُس نے
مجبور ہو کر قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ اسے عمر قید
ہو گئی تو اس کی ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا
اور میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کتنا وقت گزر گیا ہو گا۔ میں
نے چونک کر اُسے دیکھا اور اُسے پلنگ پر بیٹھنے کو کہا۔

"تمہارے بھائی نے ساری بات سُنا دی ہے" — میں جذبات
سے نکل کر تھانیداری میں آگیا اور اس لڑکے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا
— "گھبراؤ نہیں۔ سزا ابھی میرے ہاتھ میں ہے معافی بھی میرے ہاتھ میں
ہے۔ میں نے تمہارے بھائی سے کہہ دیا ہے کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔
تم نے جو کیا ہے اچھا کیا ہے۔ اس بدکار اور بے غیرت آدمی کا انجام یہی
ہونا چاہیے تھا۔ تم نے اُس کی لاش نہیں دیکھی۔ تم نے اُسے قتل کیا اور
اُس کی لاش کُتوں اور گدھوں نے کھائی ... مجھے تمہاری زبان سے سارا
واقعہ سُننے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہارے بھائی نے ہر ایک بات بتا دی
ہے، پھر بھی تم مجھے سنا دو۔ میں تمہاری بچت کا راستہ نکال لوں گا" — میں
نے اُسے سوچنے کا موقع نہ دیا اور کہا — "یہ ڈنڈہ راستے میں کیوں پھینک
دیا تھا؟"

"ہم تینوں نے لاش اُٹھا رکھی تھی" — اُس نے جواب دیا — "ڈر تھا
کہ کوئی دیکھ لے گا۔ راستے میں ہم نے ہاتھ بدلے تو ڈنڈہ گر پڑا۔"

لڑکے نے میری حوصلہ افزائی اور میرے لُقموں سے ساری کہانی سُنا
دی۔ اُس نے مقتول کی اخلاقی حالت وہی سنائی جو آپ کو سنا چکا ہوں۔
لڑکے کے بیان کے مطابق مقتول خود بھی غنڈہ تھا اور اُس کا دوستانہ
بھی غنڈوں اور ڈاکوؤں کے ساتھ تھا۔ شراب پیتا تھا۔ نمبردار اُس کا
دوست تھا۔ انہوں نے سارے گاؤں کو ڈرا کر رکھا ہوا تھا۔ سروری کے
چھوٹے بھائی نے ایک نیا واقعہ سنایا۔ دو سال گزرے یہ لڑکا کھیتوں میں گیا۔
اُس کے ہاتھ میں غلیل تھی۔ ایک فاختہ کو اُس نے غلّہ مارا۔ فاختہ درخت
سے گری، پھر اُڑی اور پھر گر پڑی۔ لڑکا اس کے پیچھے گیا۔ فاختہ گرتی اور
بھاگتی رہی۔ لڑکا دُور نکل گیا۔

دو آدمی معلوم نہیں کہاں سے آئے۔ ایک نے لڑکے کے مُنہ پر ہاتھ

رکھا اور مُنہ پر کپڑا باندھ دیا۔ دوسرے نے اُسے اُٹھا لیا پھر اُس کی آنکھوں پر بھی کپڑا باندھ دیا گیا۔ اُسے کسی کمرے میں لے جا کر بند کر دیا گیا۔ تیسرے روز کمرے کا دروازہ کسی کے بڑے زور کے دھکے سے کھُلا۔ لڑکے نے دیکھا کہ فیض کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ لڑکا ڈر گیا۔ دو آدمی دوڑتے ہُوئے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے فیض کو للکار کر کہا کہ جان پیاری ہے تو یہاں سے چلے جاؤ۔ فیض نے کہا کہ میں لڑکے کو لے کر جاؤں گا۔ فیض نے دونوں پر خنجر کے کئی وار کئے لیکن کسی کو خنجر نہ لگا۔ وہ آدمی خالی ہاتھ تھے۔ وہ فیض کو پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ آخر وہ فیض سے ڈر کر بھاگ گئے اور فیض لڑکے کو لے آیا۔

فیض لڑکے کو اس کے گھر لے آیا۔ گھر والے رو رو کر بُرا حال کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ بُری حالت سروری کی تھی۔ فیض نے بتایا کہ اُس نے گاؤں گاؤں جا کر لڑکے کا سراغ لگانے کی کوشش کی تھی آخر اُسے پتہ چل گیا اور وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر لڑکے کو چھُڑا لایا۔ فیض نے کہا کہ لڑکا چونکہ بہت خوبصورت ہے اس لئے وہ آدمی اُسے کسی نواب یا کسی مہاراجے کے ہاتھ بیچنا چاہتے تھے۔

"تم نے اُن دونوں کو دیکھا تو تھا" — میں نے اُس سے پُوچھا — "تم انہیں پہچان سکتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح دیکھا تھا" — اُس نے کہا — "یہ جو دو آدمی باہر ہتھکڑیوں میں بندھے ہُوئے ہیں، شاید یہی تھے۔"

میں نے فیض کے دونوں ساتھیوں کو ابھی ساتھ ہی رکھا ہُوا تھا کیونکہ کسی نہ کسی نشاندہی کے لئے مجھے اُن کی ضرورت محسوس ہو سکتی تھی۔

اب اس لڑکے نے اپنے اغوا کی واردات سنائی تو اُس نے دو سال بعد اُن دونوں کو پہچان بھی لیا۔ مجھے کچھ شک ہُوا جو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ میں پہلے اس لڑکے کا بیان لینا چاہتا تھا۔

لڑکے نے بتایا کہ اس کے بعد فیض اُن کے گھر آنے جانے لگا۔ لڑکے

کے متعلق ماں باپ اور بڑے بھائی کو تو پریشان ہونا ہی تھا، سروری بہت پریشان رہنے لگی۔ لڑکے نے بتایا کہ سروری کو اُس سے بہت ہی زیادہ پیار ہے۔ لڑکا اب بھی یعنی دو سال بعد بھی باہر نکلتا تھا تو سروری دروازے میں کھڑی اُسے دیکھتی رہتی تھی۔ اگر وہ باہر کچھ دیر لگا دیتا تو سروری اُسے ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ رات کو لڑکے کی چارپائی اپنی چارپائی کے ساتھ جوڑ کر بچھاتی تھی۔ ماں باپ سروری کے اس دیوانہ وار پیار پر ہنستے بھی تھے، پریشان بھی ہوتے تھے۔ لڑکا کبھی کبھی اس کے پیار سے تنگ آ جاتا تھا۔

بھائی کی حفاظت کی قیمت جو بہن نے دی

فیض نے سروری کا رشتہ مانگا۔ لڑکے نے اپنے باپ کو اُس کی ماں سے یہ کہتے سنا کہ فیض شادی شدہ ہے اور اپنی بیوی کو اپنے گھر بساتا نہیں۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ آدمی بدچلن ہے۔ شرابی اور جواری ہے۔ ماں نے بھی رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ لڑکی کا رشتہ مانگنے دو گھرانے آتے۔ دونوں ایک ایک بار آئے، پھر انہوں نے اِدھر کا رُخ نہ کیا۔

لڑکے (سروری کے بھائی) کو اب آ کر پتہ چلا کہ سروری فیض کو چاہتی ہے اور جو کوئی اس کا رشتہ لینے آتا ہے، اُسے فیض دھمکی دے کر ڈرا دیتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ سروری کی اس کے ساتھ گہری دوستی ہے اور وہ کسی اور کو قبول نہیں کرے گی۔

لڑکے نے اُس لڑکے کا واقعہ بھی سُنایا جس نے شادی کا دن مقرّر ہونے کے باوجود شادی سے انکار کر دیا تھا۔ سروری کے اس چھوٹے بھائی نے مجھے سنایا کہ گاؤں میں یہ مشہور ہو گیا کہ سروری کہتی پھرتی ہے کہ وہ فیض کے ساتھ ہی شادی کرے گی۔ لڑکے نے سروری سے پوچھا اور سروری سے یہ بھی کہا کہ اُس کے متعلق جو مشہور ہو گیا ہے وہ اگر سچ ہے تو وہ اُسے جان سے مار دے گا۔ سروری نے اُسے کہا کہ ہاں، میں

نے کہا ہے کہ میں فیض کے ساتھ ہی شادی کروں گی لیکن یہ میں نے صرف تمہارے لئے کہا ہے۔

لڑکا بہت حیران ہُوا کہ اُس کی خاطر اُس کی بہن فیض جیسے بدمعاش کو کیوں پسند کر رہی ہے؟ — سروری نے اسے کہا — "اگر فیض نہ ہوتا تو تم کبھی کے اغوا یا قتل ہو چکے ہوتے۔ فیض کو میں تمہاری حفاظت کی یہ قیمت دے رہی ہوں کہ اس کے ساتھ شادی کروں گی"

سروری نے لڑکے کو یقین دلایا کہ فیض کے ساتھ اُس کے تعلقات پاک صاف ہیں۔ لڑکے نے سروری کے دل سے یہ وہم نکالنے کی بہت کوشش کی کہ وہ اغوا ہو جائے گا مگر بہن اپنے چھوٹے بھائی کے لیے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اُن کا باپ شریف آدمی تھا۔ اُسے بھی فیض نے دھمکی دے رکھی تھی کہ سروری کا رشتہ باہر چلا گیا تو سارے خاندان کا انجام بڑا خوفناک ہوگا۔ یہ دونوں بھائی تنگ آ چکے تھے۔ باپ انہیں لڑائی جھگڑے سے منع کرتا رہتا تھا۔

آخر نصیر نے نادر علی کے لئے بات کی۔ سروری کے باپ نے رشتہ دے دیا۔ فیض کو پتہ چلا تو اُس نے نصیر کو دھمکی دی۔ نصیر پھر بھی آتا رہا۔ نصیر آخری بار آیا تو سروری کے باپ نے اُسے کہا کہ نادر علی کی ماں سے کہے کہ وہ اب خود آئے اور منگنی کر لے یا سیدھا شادی کا دن مقرر کر لے۔ نصیر نے دونوں بھائیوں کو بتایا تھا کہ فیض اُسے دھمکیاں دے رہا ہے اور وہ فیض کا چیلنج قبول کر چکا ہے۔ نصیر چلا گیا۔ تیسرے چوتھے روز ایک آدمی شہر سے آیا جس نے اپنا نام نادر علی بتایا۔ اُس نے کہا کہ نصیر اُسی کے رشتے کی بات چلا رہا ہے اور وہ اس لئے آیا ہے کہ نصیر واپس نہیں پہنچا۔

نادر علی کی سروری کے باپ کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔ باپ نے اُسے رات وہیں ٹھہرنے کے لئے کہا۔ نادر علی نے سروری کے باپ سے کہا کہ نصیر نے اسے فیض کی غنڈہ گردی کی کچھ باتیں سنائی ہیں۔ باپ کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے کہا کہ وہ فیض سے بچنے کی کوشش کر رہا

ہے۔ اگر اُس نے فیض کے ساتھ ٹکر لی تو اُس کے دونوں بیٹے جوان ہیں۔ یہ مارے جائیں گے یا کسی کو مار کر پھانسی چڑھ جائیں گے۔

نادر علی اپنی دنیا کا بادشاہ اور بڑے مضبوط دل والا جوان تھا۔ اُس نے سروری کے باپ سے تو کچھ نہ کہا، دونوں بھائیوں کو الگ بٹھا کر کہا کہ فیض سے ٹکر لینی ہے اور اُس کے ہوش ٹھکانے لانے ہیں۔ دونوں بھائی پہلے ہی تیار تھے۔ وہ سوچتے رہے کہ کب ٹکر لی جائے۔ نادر علی نے کہا کہ شادی پر موقعہ مل جائے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ شہر سے آدمی بارات کے ساتھ لے آئے گا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ موقعہ اگلے ہی دن پیدا ہو جائے گا۔ دونوں بھائی نادر علی سے بہت متاثر ہُوئے اور شیر ہو گئے۔

اغوا ایک ناٹک، قتل ایک حقیقت

اگلی صبح نادر علی اُن کے گھر سے روانہ ہُوا۔ دونوں بھائی گاؤں سے باہر تک اُس کے ساتھ گئے۔ لڑکے نے مجھے بتایا کہ نادر علی نصیر کے متعلق بہت پریشان تھا اور اُس کی تلاش میں ایک اور گاؤں کو جا رہا تھا جہاں نصیر درخت خریدنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں نے گاؤں کے باہر نادر علی کو الوداع کہی اور اُسے جاتا ہُوا دیکھتے رہے۔ وہ اِن دونوں کو بہت اچھا لگا تھا۔

نادر علی دُور نکل گیا تو اُنہوں نے دیکھا کہ فیض بہت تیز تیز نادر علی کے پیچھے جا رہا تھا۔ بھائیوں نے آپس میں بات کی کہ فیض نادر علی کا راستہ روکے گا اور اُسے دھمکی دے گا۔ چلو، آج ہی ٹکر ہو جائے۔ نادر علی کے پاس بید کا موٹا ڈنڈہ تھا۔ ان بھائیوں کو معلوم تھا کہ فیض اپنے پاس چاقو یا خنجر رکھتا ہے۔ دونوں اپنے گھر آئے۔ ان کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا، ورنہ وہ کلہاڑیاں لے کے جاتے۔ انہوں نے ڈنڈے اُٹھائے اور

گھر والوں کو بتائے بغیر نکل گئے۔ کسی کو بھی شک نہ ہُوا کہ یہ لڑکے کتنی سنگین واردات کرنے جا رہے ہیں۔ اُن کا ارادہ یہ تھا کہ فیض کو ڈنڈوں سے پیٹیں گے۔

دونوں اُدھر چلے گئے جدھر فیض اور نادر علی گئے تھے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ آگے زمین نیچے چلی جاتی تھی۔ دونوں بہت تیز ہو گئے۔ دیکھا کہ فیض نے نادر علی کو روک لیا تھا اور وہ باتیں کر رہے تھے۔ بھائی قریب گئے تو نادر علی فیض سے کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی اور تھے جو تیرے رعب میں آ گئے تھے — فیض نے دونوں بھائیوں کو دیکھا تو انہیں کہا — "اسے میرے ہاتھ سے مرنے سے بچاؤ لڑکو اور اسے بتاؤ کہ تم دونوں اس کے نہیں میرے سالے بنو گے"۔

چھوٹے بھائی نے مجھے بڑے اطمینان سے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ فیض کی یہ بات سُن کر اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ فیض کے پہلو کی طرف کھڑا تھا۔ اُس نے پوری طاقت سے ڈنڈہ فیض کے سر پر مارا لیکن اُس نے سر بچا لیا اور ڈنڈہ اس کی گردن کے پچھلے حصّے پر پڑا۔ وہ دُہرا ہو گیا۔ لڑکے نے دوسرا ڈنڈہ اس کی پیٹھ پہ مارا اور اس کے ساتھ اُس کے بڑے بھائی نے اور نادر علی نے فیض پر ڈنڈوں کا مینہ برسا دیا۔ اُس کی پگڑی سر سے اُتر گئی اور اُس کے ننگے سر پر بھی ڈنڈے پڑے۔ اُن کا ارادہ قتل کا نہیں تھا لیکن دونوں بھائی باؤلے ہو گئے تھے۔ فیض پیٹھ کے بل پڑا تھا اور دونوں بھائی اُس کے پیٹ پر اور سینے پر ڈنڈے مار رہے تھے۔ نادر علی نے قہقہہ لگا کر کہا — "اوئے شیرو! بدبخت مر گیا ہے۔ رُک جاؤ"۔

انہوں نے نبضیں دیکھیں۔ وہ مر چکا تھا۔ وہ جگہ نشیبی تھی اور ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ انہیں کسی نے بھی نہ دیکھا۔ علاقے سے وہ واقف تھے۔ خون کا ایک قطرہ نہ نکلا۔ لڑکے نے مجھے بتایا کہ انہوں نے لاش کس طرح اُٹھائی اور ویران علاقے میں گئے تو انہیں ٹیلے میں ایک فراخ سوراخ

نظر آ گیا۔ انہوں نے لاش سوراخ یعنی گُف میں رکھ کر آگے دھکیل دی۔ نادر علی نے دونوں بھائیوں سے کہا کہ خواہ کچھ ہو جائے، اگر شک میں پکڑے جاؤ تو جُرم کا اقرار نہ کرنا۔ انہیں تسلّی دلاسہ اور حوصلہ دے کر نادر علی اگلے گاؤں چلا گیا اور دونوں بھائی اپنے گھر آ گئے۔ انہوں نے گھر میں کسی کو نہ بتایا کہ وہ فیض کو قتل کر آئے ہیں۔

اس نوعمر لڑکے نے جس انداز اور جس دیانت داری سے مجھے اپنے جُرم کی تفصیل سُنائی اس سے میرا دماغ کسی اور طرف چل پڑا۔ اُس وقت میں بھی جوان تھا۔ خون جلدی جوش میں آ جاتا تھا۔ میں نے اس کے بڑے بھائی کو اندر بلایا اور اُسے بتایا کہ تمہارے بھائی نے مجھے کہانی سُنا دی ہے۔ بڑے بھائی کے چہرے پہ غصّے کا رنگ آیا۔ میں نے اُسے اپنے پاس بٹھا کر جب اپنا ارادہ بتایا تو وہ کتنی ہی دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے میری بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال میں نے اُسے ٹھنڈا کر لیا اور وہ بھی اقبالی باتوں پہ اُتر آیا۔

میں نے فیض کے دونوں جرائم پیشہ ساتھیوں کو لڑکوں کی موجودگی میں اندر بلایا۔ وہ ہتھکڑیوں میں تھے۔ میں نے اُن کی ہتھکڑیاں کُھلوا دیں اور کانسٹیبل کو باہر بھیج دیا۔ اُن سے پوچھا کہ دو سال گزرے، کیا انہوں نے اس لڑکے کو اغوا کیا تھا؟ — مجھے ایک شک تھا جس کا تعلق سروری کے ساتھ تھا۔ میں وضاحت یا تردید چاہتا تھا۔ گو قتل کی واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اِن دونوں آدمیوں نے مجھے یہ بتا کر میرا شک یقین میں بدل دیا کہ یہ ایک ناٹک تھا جو فیض نے کھیلا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ سروری اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ پاگلوں کی طرح پیار کرتی ہے۔ فیض نے اپنے اِن ساتھیوں سے کہا کہ وہ اِس لڑکے کو اغوا کر لیں اور اس کی آنکھوں پہ کپڑا باندھ کر اینٹوں کے پُرانے بھٹے کی کوٹھڑی میں پہنچا دیں۔ ایک دن رات وہیں رکھیں، پھر وہ وہاں ایسے پہنچے گا جیسے اچانک آ گیا ہو۔ وہ

دونوں اُسے پکڑنے کی کوشش کریں گے، پھر دونوں بھاگ جائیں گے اور فیض لڑکے کو سروری کے حوالے کر کے کہے گا کہ میں جان پر کھیل کر تمہارے بھائی کو چھڑا لایا ہوں، ورنہ لڑکا کسی نواب یا مہاراجے کے محل میں پہنچا دیا جاتا۔

انہوں نے یہ ناٹک کامیابی سے کھیلا۔

لڑکی کو بلیک میل کیا

دونوں بھائیوں کو اور دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کو میں نے ہتھکڑیوں کے بغیر نمبردار اور کانسٹیبلوں کے ساتھ تھانے کو روانہ کر دیا۔ سروری کے باپ کو اندر بلایا تو بیس اکیس سال کی عمر کی ایک بڑی ہی حسین لڑکی دوڑتی ہوئی اندر آئی اور میرے قدموں میں گر پڑی ـــ یہ سروری تھی ـــ اُس کا باپ بھی اندر آ گیا۔ میں نے باپ سے کہا کہ وہ ذرا باہر ہی ٹھہرے۔ وہ باہر نکلا تو میں نے سروری کو اُٹھایا۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سُوجی ہوئی تھیں۔

"میرے بھائیوں کو کہاں بھیج دیا ہے؟" ـــ اُس نے میری ٹھوڑی پکڑ کر کہا ـــ "اگر دونوں کو نہیں چھوڑ سکتے تو چھوٹے کو چھوڑ دو۔ اُس کی جگہ مجھے پکڑ لو۔"

اُس نے چھوٹے بھائی کی رہائی کے لئے جس طرح منتیں کیں اور جس طرح اللہ اور رسولؐ کے واسطے دیئے، اس سے میرے جذبات اُبل پڑے۔ اُسے سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا۔

"دیکھو سروری!" ـــ میں نے اُس پر قابو پانے کے لئے کہا ـــ "تمہارے پیچھے ایک آدمی قتل ہو گیا ہے اور دو اتنے جوان اور خوبصورت بھائی پکڑے گئے ہیں۔ تم نے ایک بدمعاش کو دل میں بٹھا کر کیا حاصل کیا ہے؟"

وہ جیسے پتھر کا بُت بن گئی ہو۔ اُس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی

ـــ "میں نے کسی بدمعاش کو دل میں نہیں بٹھایا۔"

"کیا تم نے یہ اعلان نہیں کر رکھا تھا کہ تم فیض کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرو گی؟"

"نہیں" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "آپ میری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔ اللہ کے سوا کون جانتا ہے کہ سچ کیا اور جھوٹ کیا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ سروری!" ـــ میں نے کہا ـــ "کوشش میری بھی یہی ہے کہ تمہارے بھائیوں کو بچا لوں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ فیض کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔ اگر اپنے بھائیوں کو بچانا چاہتی ہو تو سچ بولنا۔ میں تمہاری مدد کروں گا لیکن مجھے سچی بات بتا دو۔"

"قرآن مجید منگوا لو" ـــ اس نے کہا ـــ "میں اللہ کا پاک کلام سر پر رکھ کر بات کروں گی۔"

اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کے اغوا کا واقعہ سُنا کر کہا کہ اُن کے گھر میں دو دن تک ماتم کا منظر بنا رہا۔ سروری کی اپنی جو حالت ہوتی وہ اُس نے یوں سُنائی ـــ "میں باہر کو دوڑتی تھی اور گھر والے مجھے جکڑ جکڑ کر رکھتے تھے۔ میں چیختی تھی۔ میں جانتی تھی کہ گاؤں کے تمام مرد میرے بھائی کو ڈھونڈنے نکل گئے ہیں۔ وہ کھڈوں، نالوں، غاروں اور ویرانوں میں میرے بھائی کو ڈھونڈ رہے تھے، مگر میں گھر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مجھے اس بھائی کے ساتھ جو پیار ہے وہ ہر بہن کو اپنے بھائی سے نہیں ہوتا۔ میں عورتوں سے کہتی تھی کہ جو آدمی میرے بھائی کو واپس لے آئے گا اُسے میں وہ انعام دوں گی کہ سب حیران رہ جائیں گے۔"

اُس نے بتایا کہ فیض کے ساتھ اُس نے کبھی کھُل کر بات نہیں کی تھی کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ وہ دوسروں کی بیٹیوں کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ وہ سروری کے گھر گیا اور کہا کہ وہ لڑکے کی تلاش کو جا رہا ہے۔ اُس نے اس شک کا اظہار کیا کہ لڑکے کو بردہ فروش اور بڑے خطرناک ڈاکو اُٹھا کر لے گئے ہیں، اور وہ اُن کے اڈے جانتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ

اپنی جان پر کھیل کر لڑکے کو لے آتے گا۔

وہ لڑکے کو لے آیا۔ لڑکے نے سب کو سنایا کہ فیض کس دلیری سے لڑکر اُسے چھڑا لایا ہے۔ اُس نے سب کو بتایا کہ اُسے کس طرح اغوا کیا گیا تھا مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جس کمرے میں اُسے قید رکھا گیا تھا، وہ کہاں ہے۔ فیض اُسے اِس کمرے سے نکال کر بڑی دُور لے گیا اور دُور سے گھُما کر گھر لایا تھا۔ سروری نے اپنے بھائی کو سینے سے لگا لیا۔ وہ فیض کو بھی اسی طرح سینے سے لگا لینے کو بیتاب ہونے لگی لیکن ایسا نہ کر سکی۔ فیض خوبرو جوان تھا۔ اسے ناپسند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب تو وہ ہیرو بن گیا تھا۔ سروری کو وہ بہت اچھا لگنے لگا۔ سروری اُس کی گرویدہ ہو گئی۔

دوسرے تیسرے دن فیض نے سروری سے ملنے کا موقعہ پیدا کر لیا۔ سروری اُسے بے تکلفی اور احسان مندی سے ملی۔ فیض لڑکیوں کے معاملے میں استاد تھا۔ اُس نے سروری کو یہ تاثر دیا کہ وہ دن رات اُسی کے تصوّر سے دل بہلاتا رہتا ہے۔ اِن دِنوں فیض نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا تھا اور اُن کی اَن بن ہو گئی تھی۔ سروری نے یہاں تک ارادہ کر لیا کہ فیض اگر اُسے شادی کے لئے کہے تو وہ مان جاتے گی اور اپنے ماں باپ کو بھی منوا لے گی، مگر دوسری تیسری ملاقات میں فیض نے اپنی بُری نیت کا اظہار کر دیا۔ سروری اُس کی ممنون تھی۔ وہ بھٹک چلی تھی لیکن اُسے خیال آگیا کہ فیض تو عورتوں کا شکاری ہے اور وہ خود شریف باپ کی بیٹی ہے۔ اُس نے فیض سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کر لے گی، شادی کے بغیر وہ اُس کے ساتھ دوستانہ تعلق نہیں رکھے گی۔

"فیض نے مجھے کہا کہ شادی بھی ہو جاتے گی"۔۔۔ سروری نے مجھے سنایا۔۔۔ "لیکن میں اپنے آپ کو مزارعوں اور معمولی معمولی لوگوں کی بیٹیوں میں شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فیض اپنے مطالبے سے باز نہ آیا۔ وہ مجھے ایک عورت کو پیغام دے کر بلایا کرتا تھا۔ میں نے ملنے سے کبھی

بھی انکار نہ کیا۔ اُس نے جب بلایا اور جہاں بھی بلایا، میں پہنچ گئی۔ میں اُسے راتوں کو کھیتوں میں بھی ملی لیکن میں نے اُسے صاف کہہ دیا کہ میں شادی کے بغیر اُس کی بیوی نہیں بنوں گی۔ ایک بار اُس نے زبردستی کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے کہا کہ تم راجپوت ہو تو میں بھی راجپوت کی بیٹی ہوں۔ ہمت ہے تو زبردستی کر کے دیکھو۔ اُسے غصّہ آگیا۔ میں نے کہا کہ غصّہ چھوڑ، تمہیں موت آجاتے تو راجپوتی خون کو ناپاک نہیں کروں گی۔ شادی کرنی ہے تو کر لوں گی۔ تم نے میرے بھائی کو موت کے مُنہ سے نکالا تھا۔ اِس کا صِلہ دوں گی"۔

اس بے چاری کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کے بھائی کا اغوا ایک ناٹک تھا جو فیض نے اُس کے سامنے ہیرو بننے کے لئے کھیلا تھا۔

"فیض سیدھے راستے پر آگیا۔ اُس نے میرے ماں باپ سے میرا رشتہ مانگا لیکن انہوں نے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ فیض شرابی کبابی آدمی ہے۔ بدمعاشوں کے ساتھ اس کا دوستانہ ہے اور اُس نے اپنی بیوی کو اس لئے اُجاڑ رکھا ہے کہ عورتوں کا دلدادہ ہے۔ میں نے ماں سے کہا کہ میں فیض کو اُس کی نیکی اور بہادری کا صلہ دینا چاہتی ہوں۔ ماں نے مجھے اُس کی باتیں سُنا کر قائل کر لیا کہ فیض کے ساتھ شادی کرنے کا نتیجہ بہت بُرا ہو گا۔ میں اپنے باپ اور بھائیوں کی عزّت کی خاطر خاموش ہو گئی....

"انکار کے بعد فیض نے مجھے بلایا تو میں چلی گئی۔ اُس نے کہا کہ تمہارے والدین نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے، اب تم کیا کرو گی؟.... میں نے اُسے جواب دیا کہ میں اپنے والدین کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔ اس پر میری اور اُس کی تُو تُو میں میں ہو گئی۔ میں غصّے سے واپس آگئی۔ دوسرے دن اُس کا پیغام ملا کہ اپنے چھوٹے بھائی کو گھر سے باہر نہ نکلنے دینا ورنہ میں اُسے ہمیشہ کے لئے غائب کر دوں گا۔

میں ڈر گئی۔ فیض کو سب جانتے تھے کہ وہ کیا کچھ کر سکتا تھا"۔

بھائی کی خاطر بدنام ہوئی

سروری کے بیان کے مطابق فیض اُسے ڈرانے لگا کہ وہ اُس کے بھائی کو غائب کر دے گا۔ سروری بھائی کے معاملے میں بہت حساس اور وہمی تھی۔ لڑکا بہت خوبصورت تھا۔ وہ فیض کی دھمکیوں سے ڈر گئی۔ وہ فیض سے ملی۔ فیض نے اُسے کہا کہ وہ اپنے ماں باپ سے کہہ دے کہ اُس کی شادی فیض سے کر دیں ورنہ پچھتائیں گے۔ سروری نے اپنے ماں باپ سے کہہ دیا۔ اس کا باپ لڑاکا نہیں تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کو بھی لڑائی سے بچانا چاہتا تھا مگر ماں باپ نے رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ سروری فیض کی دھمکیوں کا اثر لیتی رہی اور اُسے ملتی رہی اور اُسے کہتی رہی کہ وہ اس کے ساتھ شادی کے لئے اپنے ماں باپ کو منوا لے گی۔

فیض نے گاؤں میں مشہور کر دیا کہ سروری نے کہا ہے کہ وہ اُس کے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرے گی۔ یہ تو سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ سروری فیض سے ملتی ہے۔ اس کی سہیلیوں کو معلوم تھا کہ رات کو اُسے کھیتوں میں بھی ملتی ہے۔ سروری بڑے عجیب چکّر میں آ گئی۔ جب اُس کے دو امیدواروں کو یکے بعد دیگرے اُس کا رشتہ دے دیا گیا اور وہ دوبارہ اُس کے گاؤں میں نہ آتے تو فیض نے اُسے بتایا کہ تمہارا رشتہ کوئی نہیں لے جا سکے گا۔ پھر سروری کی شادی کا دن مقرر ہُوا تو ہونے والے دولہا کو لوگ بیہوشی کی حالت میں ویرانے میں سے اُٹھا لائے تو فیض نے سروری سے کہا کہ یہ اُس کی کارستانی ہے اور وہ اُس کے چھوٹے بھائی کو غائب کر سکتا ہے۔ سروری بہت زیادہ ڈر گئی۔ اب فیض صرف رشتہ لینے پر زور دیتا تھا۔

اتنے میں نصیر آ گیا۔ اُسے بھی فیض نے دھمکیاں دیں۔ نصیر نے

سروری کے ماں باپ کو بتایا اور اُس نے بڑی دلیرانہ باتیں کیں۔ پھر نادر علی نصیر کو ڈھونڈتا آن پہنچا۔ سروری نے نادر علی کو دیکھا تو اُس نے عہد کر لیا کہ وہ فیض پہ لعنت بھیجے گی اور نادر علی کے ساتھ شادی کرے گی۔ رات نادر علی نے سروری کے گھر بیٹھ کر کہا کہ وہ فیض کو ایسا غائب کرے گا کہ اُس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ سروری کو نادر علی کی یہ باتیں بہت اچھی لگیں۔ نادر علی چلا گیا، اور اُسی روز فیض بھی غائب ہو گیا۔

"مجھے فیض کے مرنے کی بہت خوشی ہے"۔ سروری نے کہا — "لیکن جس بھائی کی خاطر میں بدنام ہوئی ہوں وہ پھانسی کے تختے کی طرف جا رہا ہے"۔

وہ پھر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور اُس کے باپ کو بلایا۔ اُس کی تو جیسے کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اپنے بیٹوں کے لئے رو رہا تھا۔ وہ فیض کو اس علاقے کا بے تاج بادشاہ کہتا تھا۔ اُس نے فیض کے جرائم کی کچھ باتیں سنائیں تو میرا خون کھول اُٹھا۔ میں نے اُسے تسلّی دی اور تھانے کو روانہ ہو گیا۔

نادر علی تھانے میں موجود تھا۔ میں نے اُسے الگ بٹھا لیا اور پہلی بات یہ کہی کہ فیض کو قتل کر کے اُس نے بہت بڑی نیکی کی ہے۔ اُس نے جرم سے انکار نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ ان دونوں لڑکوں کو چھوڑ دو اور مجھ اکیلے کو گرفتار کر لو۔ میں نے اُسے کہا کہ میں تینوں کو گرفتار کروں گا اور انشاء اللہ تینوں واپس آ جاؤ گے — نادر علی کے متعلق مجھے یقین ہو چکا تھا کہ نصیر کی بیوی کے ساتھ اُس کے تعلّقات بھائیوں والے ہیں۔

میں نے نمبردار کو جو گالیاں دیں وہ میں لکھ نہیں سکتا، پھر اُسے کہا کہ میں اُس کی نمبرداری ختم کرا کے اُسے بستہ الف کا بدمعاش لکھ لوں گا۔ نمبردار کے لئے یہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں دراصل اُسے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اُسے جب بتایا کہ اپنی نمبرداری بچانے کے لئے وہ کیا کرے اور جو کچھ کرے اُسے راز میں

رکھے تو وہ ہاتھ جوڑ کر راضی ہو گیا۔

دو لوں جرائم پیشہ آدمیوں سے کہا کہ انہوں نے ایک آدمی کو اغوا کر کے حراست میں رکھا ہے، اُس کی انہیں پانچ پانچ سال سزا دلاؤں گا۔ انہیں بچنے کی ایک صورت بتائی اور وہ چونکہ اُستاد تھے، اس لئے مان گئے۔ میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ نصیر کو بھی میں نے سمجھا لیا۔

میں ان تفصیلات میں جانا بیکار سمجھتا ہوں کہ میں نے کس کو کیا کہا اور کاغذات میں کیا کچھ لکھا۔ مختصر یہ کہ میں نے نصیر کے اغوا کے کیس پر یہ رپورٹ لکھی کہ نصیر فلاں گاؤں میں گیا اور بیمار ہو گیا تھا، لاپتہ نہیں ہُوا تھا۔ فیض کے قتل کا چالان نادر علی اور دونوں بھائیوں کے خلاف تیار کر کے عدالت میں دے دیا۔ تینوں کو چار پانچ مہینے جوڈیشنل حوالات میں رہنا پڑا لیکن سیشن میں کیس چلا تو تینوں کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا گیا — میں نے استغاثہ کچھ ایسا ہی تیار کیا تھا۔

بری ہونے کے ایک ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ نادر علی سروری کو بیاہ لایا ہے۔

